پاکستانی معاشرہ

پاکستانی معاشرہ

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلیکیشنز

بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ، لاہور، پاکستان

e-mail: tarikh.publishers@gmail.com

نام کتاب : پاکستانی معاشرہ

مصنف : ڈاکٹر مبارک علی

اہتمام : ظہور احمد خاں

پبلشرز : **تاریخ پبلیکیشنز**

بک سٹریٹ 39-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور

سرورق : ریاض ظہور

اشاعت : 2012ء

قیمت : -/160 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39-مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی



فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدرآباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

اسلم گورداسپوری کے نام!

فہرست

پیش لفظ

پاکستان کا معاشرہ وقت کے ساتھ تبدیل ہو رہا ہے۔ مگر اس کی تبدیلی کی تہہ میں جو نظریات ہیں وہ اس تبدیلی کو مثبت بنانے کے بجائے، اس کو اور زیادہ پس ماندگی کی جانب لے جا رہے ہیں، اگر ہم خرابی کی جڑوں سے واقف ہو جائیں تو اس صورت میں اس کا علاج ممکن ہے۔ مگر علاج کے لئے جس قبولیت کی ضرورت ہے اگر وہ نہ ہو تو تبدیلی کا وقت مثبت نتائج لے کر نہیں آتا ہے۔

یہاں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ معاشرہ کی بنیاد میں جو خرابی ہے اس کی جانب توجہ دلائی جائے۔ شاید یہ لوگوں میں شعور کے ساتھ ساتھ معاشرہ کو بدلنے میں مدد دے سکے۔

ڈاکٹر مبارک علی

جون 2012ء

لاہور

پاکستانی معاشرہ ـــــ ایک تجزیہ

پاکستان کا معاشرہ اس وقت جس صورت حال سے گذر رہا ہے۔اس کے نتیجے میں سوچنے والے اور احساس رکھنے والے لوگوں میں یہ سوالات پیدا ہو رہے ہیں کہ آخر ہم کیوں پس ماندگی کی اس انتہا کو پہنچے، اور کیا اس کا کوئی حل ہے کہ ہم اپنی صورتِ حال کو بدل دیں، اور ترقی اور خوش حالی کو حاصل کر سکیں۔

یہ سوال اس وقت اور اہم ہو جاتا ہے کہ جب ہم کولونیل ازم سے آزاد ہونے کے بعد ترقی کے بجائے تنزل کو دیکھتے ہیں، اور سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا کولونیل حکمرانوں کا یہ خیال صحیح تھا کہ جب تک ہم حکومت کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے اس وقت تک ہمیں آزادی نہیں ملنی چاہئے تھی۔

پاکستان جواب تک پس ماندگی کا شکار ہے اس کے مقابلے میں دوسرے ملکوں نے آزادی سے فائدہ اٹھایا اور ترقی کی جیسے سنگاپور جو نو آبادیات میں سے ایک تھا آزاد ہونے کے بعد اس کی ترقی قابل دید ہے۔ملیشیا بھی ہماری طرح غیر ملکی اقتدار میں رہا مگر آج وہ ترقی اور خوش حالی کی علامت ہے، ہندوستان نے بھی آزادی کے

بعد جو ترقی کی ہے وہ ہمارے لئے ایک مثال ہے۔ لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر پاکستان کیوں پس ماندہ رہا۔ آزادی کے بعد اس کو بھی تعلیم یافتہ بیوروکریسی ملی تھی، تربیت یافتہ فوج تھی اور سیاسی لیڈر تھے کہ جنہوں نے آزادی کے لئے جدوجہد کی تھی، اور ان لوگوں نے پاکستان کے ابتدائی سالوں میں بڑے جذبے اور خلوص کے ساتھ کام کیا اور ملک کو اپنے قدموں پر کھڑا کیا۔ مگر یہ کیا ہوا کہ یہ جذبہ بھی غائب ہو گیا اور ملک کو آگے بڑھانے اور ترقی دینے کی خواہشات دم توڑ گئیں۔

ایک خیال یہ ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے نتیجہ میں پنجاب اور سندھ کا متوسط طبقہ جو ہندوؤں اور سکھوں کی شکل میں تھا وہ یہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان چلا گیا۔ اس کی جگہ جو خلاء پیدا ہوا، اسے آنے والے مہاجرین کا متوسط طبقہ پُر نہیں کر سکا۔ متوسط طبقہ کی اس کمزوری کی وجہ سے جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے اقتدار کو قائم کر لیں۔ اس وجہ سے ابتداء ہی سے یعنی 1946ء کے انتخاب سے جاگیرداروں کو فوقیت ملتی چلی گئی۔ مسلم لیگ جو اس وقت واحد مضبوط سیاسی جماعت تھی، اس پر ان کا غلبہ ہو گیا۔

سندھ اور پنجاب ایک طرف تو جاگیردار تھے، تو دوسری طرف سجادہ نشین تھے جو اپنے بزرگوں کی روحانیت کے وارث بن کر درگاہوں اور خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔

جاگیرداری اور سجادہ نشینی دونوں اداروں کی بنیاد ماضی کی روایات پر ہے کہ جن میں مزارعین اور عام دیہاتیوں کو یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ ان کے مسائل کا حل انہی

سرداروں، جاگیرداروں اور پیروں کے پاس ہے۔ لہٰذا ان روایات سے روگردانی کرنے کا مطلب بغاوت تھا۔ ان میں یہ احساس اس قدر مضبوط اور طاقت ور تھا کہ وہ خاموشی سے ہر ظلم اور استحصال کو برداشت کرتے تھے۔ کولونیل دور میں یہ حکمرانوں کے لئے اس لئے افادیت کا باعث تھا کہ وہ اس کے ذریعہ عام لوگوں کو اپنے تسلط میں رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے جاگیرداروں اور پیروں کی سرپرستی کی تاکہ وہ ان کا وفادار رہ کر ان کے اقتدار کو مستحکم کریں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے برطانوی حکومت کی وفاداری میں اپنی دولت، اور ذرائع کو صرف کیا۔ جنگوں کے موقع پر انہیں مالی امداد دی اور اپنے علاقے سے زبردستی نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کرایا۔ اس وفاداری کے عوض حکومت نے نہ صرف ان کی جائیداد کو تحفظ دیا، بلکہ انہیں مزید زمینیں دے کر ان کے اثر و اقتدار میں اضافہ کیا۔

اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت ان جاگیرداروں اور پیروں کے خاندان جو پاکستان میں حکمران بنے ہوئے ہیں یہ ان کی اولاد ہیں کہ جنہوں نے برطانوی حکومت سے وفاداری کے عوض جائیدادیں اور خطابات پائے تھے۔ المیہ یہ ہے کہ یہ لوگ آج بھی ان خطابات پر فخر کرتے ہیں، اور اپنی خاندانی وجاہت اور بزرگی کی جڑیں اس میں تلاش کرتے ہیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ کیوں ان خاندانوں کے ماضی کو نہیں دیکھتے اور ان کی عزت و تکریم کرتے ہیں؟

اب اگر تاریخ میں ان لوگوں کے کردار اور اعمال کا جائزہ لیا جائے، اور اس کا

تجزیہ کیا جائے کہ ان جاگیرداروں اور پیروں نے اپنے مفادات کے لئے اپنے لوگوں کی قربانی دی، تو اس صورت میں ان کی صحیح تصویر سامنے آئے گی۔ چونکہ ہماری تاریخ میں کولونیل ازم کا پوری طرح سے جائزہ نہیں لیا گیا، اس لئے لوگوں کے ذہن میں یہ بیٹھا ہوا ہے کہ انگریزی دور انصاف اور خوش حالی کا دور تھا۔ جب تک ہم اس دور کا تجزیہ نہیں کریں گے، انگریزوں کے وفادار اور ان سے تعاون کرنے والے اس معاشرے میں باعزت رہیں گے۔

اگر دیکھا جائے تو ملک کی آزادی کا فائدہ بھی اس طبقے کو ہوا جب تک انگریز یہاں کے حکمران تھے یہ ان کے وفادار اور زیرنگیں تھے اور ان کی سرپرستی میں ان کی سرگرمیاں محدود تھیں۔ جب انگریز چلا گیا تو یہی طبقہ حکمران بن کر ابھرا، اب حالانکہ ان کی سرگرمیوں کو اور ان کی بداعمالیوں کو روکنے والا کوئی نہیں تھا، اس لئے آزاد تھے کہ جو چاہیں وہ کریں، اور ان کے لئے آزادی کا مطلب یہ تھا کہ اپنے مزارعین کی محنت پر خود عیاشی اور آزادی کی زندگی گذاریں۔

پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ اس کا جاگیردارانہ نظام اور کلچر ہے۔ مغرب میں جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام کے اندر سے ابھری کہ جس میں متوسط طبقے نے اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان میں یہ جمہوریت جاگیردارانہ اور سرداری نظام کے اندر محدود ہو کر رہ گئی۔ جس میں نہ تو متوسط طبقے کو ابھرنے اور تبدیلی کا ایجنٹ بننے کا موقع ملا اور نہ ہی یہ عوامی فلاح و بہبود کے لئے اثر انداز ہو سکی۔

لہٰذا پاکستان میں جاگیردارانہ جمہوریت میں جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کے علاوہ کسی اور طبقے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ سیاست موروثی ہوگئی ہے اور اقتدار ان موروثی خاندانوں میں تقسیم ہوتا رہتا ہے۔ اس صورت میں معاشروں کے اندر سے تبدیلی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔

اگر تبدیلی آتی ہے تو ایک خاندان کے بجائے دوسرے خاندان کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ عوام کے لئے کوئی ذریعہ نہیں کہ وہ اپنے نمائندے منتخب کر سکیں۔ یہ تبدیلی پنڈولم کی طرح کی ہے کہ جس میں وہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں حرکت کرتا ہے۔

اس جمہوری عمل کا ایک اظہار یہ ہے کہ خاندانی سیاست کی وجہ سے ہر نئی نسل زیادہ سے زیادہ نا اہل ثابت ہو رہی ہے۔ اب حکومت اور اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے کہ جن میں نہ فہم ہے اور نہ فراست۔

اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوج اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے۔ جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک قانونی اور دوسرا معاشرے کے اندر سماجی و معاشی تبدیلیاں۔ قانونی طور پر اس کو اس لئے ختم نہیں کیا جا سکتا ہے کہ پارلیمنٹ میں اکثریت انہیں جاگیرداروں اور پیروں کی ہے جو کسی ایسے قانون کو پاس نہ ہونے دیں گے کہ جس سے ان کی جائیداد اور مراعات کا خاتمہ ہو۔ ماضی میں جو زرعی اصلاحات بھی ہوئیں۔ انہیں بھی انہوں نے ناکام بنا دیا اور جب ضیاء الحق کے زمانے میں شریعت کورٹ کے فیصلہ میں یہ اصلاحات غیر اسلامی ہوگئیں تو کچھ جاگیرداروں نے مزارعین سے اپنی زمینیں واپس لے لیں۔ لہٰذا موجودہ صورت حال میں نہ تو

زرعی اصلاحات کی امید ہے اور نہ جاگیرداروں کے خاتمے کی۔

دوسری صورت میں شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی اور ان شہروں میں متوسط طبقے کے ابھار کی صورت میں تبدیلی کی توقع ہے کہ متوسط طبقہ سیاسی طور پر اتنا طاقت ور اور متحرک ہو جائے کہ وہ اس نظام کو چیلنج کر سکے۔

مگر یہ صورت حال بھی پُر امید نہیں ہے، کیونکہ سندھ میں جو متوسط طبقہ ابھر رہا ہے وہ قوم پرستی کے ناطے جاگیرداروں اور پیروں سے جڑا ہوا ہے۔ پنجاب میں متوسط طبقہ حکمران اداروں میں شمولیت کر کے اپنے کردار کو کھو چکا ہے۔ اس لئے ایک طویل عرصہ کے لئے ایسی صورت نظر نہیں آتی ہے کہ جو اس نظام کو ختم کر سکے گی۔ لیکن تاریخ میں بعض اوقات تبدیلیاں اچانک ہوتی ہیں، اور پورے نظام کو بدل دیتی ہیں۔

اس لئے معاشرے کی بے چینی، انتشار، اور خلفشار شاید کوئی ایسی صورت اختیار کر لے کہ جو تبدیلی کے عمل کو تیز کر سکے۔

ریاست کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو تشدد کی اجارہ داری حاصل ہوتی ہے۔ اگر ریاست اور اس کے ادارے مضبوط ہوں تو وہ معاشرے میں کسی گروپ یا جماعت یا فرد کو اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں کہ وہ تشدد کو اختیار کریں، اور اس کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کریں۔

لیکن اگر ریاست کمزور ہو، اور اس کے ادارے طاقت ور نہ ہوں تو اس صورت میں مختلف جماعتیں اور پارٹیاں تشدد کو اختیار کر کے ریاست اور اس کے قوانین کی

مخالفت کرتی ہیں۔

اگر اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے پاکستان کی ریاست اور اس کے اداروں کا جائزہ لیا جائے، تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پاکستان کی ریاست اس قدر کمزور ہوگئی ہے اور اس کے ادارے اس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے ہیں کہ تشدد اور دہشت گردی معاشرے کے مختلف گروہوں میں آ گئی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ گروہ اس قدر طاقت ور ہو گئے ہیں کہ ریاستی اداوے ان کے سامنے بے بس اور مجبور نظر آتے ہیں۔ جب ریاستی ادارے لوگوں کی جان و مال کی حفاظت نہ کرسکیں تو اس کی وجہ سے ریاست کی عزت و احترام کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور لوگ اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے تحفظ کے لئے کسی گروہ یا مافیا کی حمایت حاصل کریں اور اس کے ساتھ وفاداری کا اظہار کریں۔ یہ صورت حال اس وقت ہمارے معاشرے میں ہے۔ جس کی وجہ سے یہ گروہ اور زیادہ طاقت ہو رہے ہیں۔ جب کہ ریاست ان کے مقابلہ میں کمزور ہو رہی ہے۔

ریاست اگر کمزور ہو تو اس صورت میں ملک میں افراتفری، انتشار اور بے چینی رہتی ہے۔ اس کی کمزوری قانون کی بالادستی کو ختم کر دیتی ہے۔ ریاست کے کمزور ادارے اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اس نا اہلی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بیوروکریسی اپنے اختیارات کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ اب جب سے ملٹی نیشنل کمپنیاں آ گئی ہیں، باصلاحیت اور ذہین افراد ان کی ملازمت میں جا رہے ہیں۔ جبکہ کم صلاحیت اور کم ذہن

کے لوگ بیوروکریسی میں آ رہے ہیں، لہٰذا یہ ادارہ بھی اس قابل نہیں رہا ہے کہ ملک کے انتظامات کو سنبھال سکے۔

فوج نے اپنے اقتدار کے زمانے میں اپنی علیحدہ سے ریاست قائم کر لی ہے، اس لئے اس سے تعلق رکھنے والے معاشی اور سماجی طور پر مراعات یافتہ طبقے بن گئے ہیں۔

لیکن دوسری جانب اس خلفشار اور ٹوٹ پھوٹ کے نتیجہ میں لوگوں میں تبدیلی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ فرسودہ نظام اور روایت کے خلاف جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہ خواہش زور پکڑتی ہے کہ مثبت تبدیلی ہی ان کی زندگی کو خوشگوار بنا سکتی ہے۔

اس ماحول میں اگر نئے خیالات وافکار تشکیل ہوں، تو لوگ خود کو فعال کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں، اس کے لئے ایسے دانشوروں کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو معاشرے کے مسائل، اور زمانے کو سمجھ کر کوئی متبادل نظام پیش کریں، تا کہ حکمران طبقوں کی بالادستی کا خاتمہ ہو، اور عام لوگ معاشرے میں باعزت مقام حاصل کر سکیں۔

پاکستان کی ریاست اور معاشرہ اس وقت اس صورت حال سے دوچار ہے۔ حکمراں طبقے کے لوگوں نے اپنے تحفظ کے انتظامات کر رکھے ہیں، لیکن عوام کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اپنی اجارہ داری کو قائم رکھنے کے لئے یہ روایات کا سہارا لئے ہوئے ہیں، لیکن یہ روایات جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہیں اور کہیں قبائلی نظام کی جنہیں مقدس بنا کر ان کے ذریعہ یہ لوگ اپنی مراعات باقی رکھے ہوئے ہیں، اس لئے دانشوروں کا یہ کام ہے کہ ان فرسودہ روایات کو چیلنج کریں، جاگیرداروں اور

قبائلی سرداروں کی روایات اور حیثیت اوران کے نقصانات لوگوں کے سامنے لائیں تاکہ معاشرہ ذہنی طور پران کوختم کر کے ایک متبادل نظام کے لئے تیار ہو۔ ایک کمزور ریاست اس قابل نہیں ہوتی ہے کہ وہ نئے خیالات وافکاراوران کے اثرات کو روک سکے۔ اگر دانشوران حالات میں خاموش رہتے ہیں، اور اپنا فرض ادانہیں کرتے، تو اس صورت میں ملک اور معاشرہ اورزیادہ پس ماندگی کاشکار ہوجاتا ہے۔

وہ دانشور کہ جوریاست اور معاشرے کی روایات پرتنقید کرتے ہیں اوران کے مقابلہ میں متبادل نظریات پیش کرتے ہیں۔ان کے لئے ریاست اور معاشرہ دونوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ دانشور ریاست کے تشدد اور دہشت گردی کو برداشت کرلیتا ہے،لیکن اگر معاشرہ کی اکثریت اس کے خلاف ہوتو وہ تنہائی کاشکار ہو کر بے بس اور مجبور ہوجاتا ہے۔

پاکستان میں لبرل، اور سیکولر ذہن کے دانشوروں کو جب معاشرے کی روایات اوراس کی ذہنیت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہےتو یہ اس کے لئے انتہائی اذیت کا مقابلہ ہوتا ہے۔اس کی سماجی زندگی محدود ہوکر رہ جاتی ہے۔اس کے معاش کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں، تاکہ وہ غربت ومفلسی کے ہاتھوں مجبور ہوکر تائب ہوجائے۔

لیکن ایک تخلیقی دانشور کے لئے یہ سزائیں اور تعصّبات کوئی حیثیت نہیں رکھتے

ہیں۔ وہ معاشرے کی ترقی اور خوش حالی کے لئے متبادل نظریات پیش کرتا رہتا ہے۔ اگر اس کے افکار کی پذیرائی اس کی زندگی میں نہ ہو تو مستقبل اس کے خیالات کو ضرور اپناتا ہے، اور اسی طرح سے معاشرے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

تبدیلی کے عمل کو روکنے کے لئے ریاست اور حکمراں طبقوں کی جانب سے عوامی فلاح و بہبود کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں ریاست خیرات وصدقہ کے نام پر ایک معمولی رقم غریب اور نادار لوگوں کو دیتی ہے۔ پاکستان میں زکوٰۃ فنڈ اور بے نظیر انکم سپورٹ اسکیم اس کی مثال ہیں۔ ان اسکیموں سے نہ تو غربت کا خاتمہ ہوتا ہے اور نہ ہی معاشرے میں خوش حالی آتی ہے بلکہ یہ تمام اسکیمیں بدنظمی کا شکار ہو کر اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔

دوسری جانب امراء اپنی نیک نامی اور شہرت کے لئے غریب لوگوں کے لئے لنگر کا انتظام کرتے ہیں، جہاں صبح وشام ان لوگوں کی قطار کھانے کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہے۔ خیرات کا یہ کھانا مزاروں پر بھی لوگوں کو ملتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں معاشرے میں ایک ایسا طبقہ جنم لیتا ہے کہ جو کام اور محنت کے قابل نہیں ہوتا ہے اور معاشرے کے لئے ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ یہ لوگ کھانے کے حصول کی جدوجہد میں زندگی کو قائم رکھتے ہیں، اور یوں انسانیت کے درجہ سے گر کر حیوانی سطح پر آجاتے ہیں، کہ جہاں زندگی تو رہتی ہے مگر عزت ووقار ختم ہو جاتا ہے۔

لہٰذا ان لوگوں میں تبدیلی کی کوئی خواہش باقی نہیں رہتی ہے اور نہ سیاسی وسماجی شعور۔

پاکستان کے قیام کے فوراً بعد یہ کہا گیا کہ ملک خطرے میں ہے، یا ملک نازک دور سے گذر رہا ہے۔اس خطرے کی وجہ سے پاکستان کوایک سیکورٹی ریاست بنادیا گیا۔

اس کے اہم اثرات لوگوں کے ذہنوں پر ہوئے۔اگر ملک مستحکم نہیں، اس کوخطرہ ہے اور یہ ایک نازک دور سے گذر رہا ہے تو پھر اس ملک میں کوئی تحفظ نہیں، لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس کوموقع ملا اس نے ہجرت کے راستے کواختیار کیا اور ملک چھوڑ کر تحفظ شدہ ملکوں میں چلا گیا۔اس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ اگر ریاست لوگوں کے جان و مال کی حفاظت نہیں کرسکتی ہے، تو افراد کواپنی زندگی اور مستقبل کی فکر خود کرنی چاہئے۔اس ذہن کی وجہ سے لوگوں میں کرپشن اور بدعنوانی پھیلی کہ کسی نہ کسی طرح سے دولت اکٹھی کی جائے اوراس کی مدد سے اپنا تحفظ حاصل کیا جائے۔

حکمراں طبقوں نے اس کا فائدہ اٹھا کرلوگوں میں خوف کی فضا پیدا کی اوراس کے سہارے اپنی بالادستی قائم کی۔ یہ صورت حال آج بھی موجود ہے۔اس نے حکومتی اداروں کو اس کا جواز فراہم کر دیا ہے کہ وہ سیکورٹی کے نام پر لوگوں کی آزادی اور مخالفت کو دبائیں، اس لئے مزاحمتی تحریکوں کوقومی مفادات کے نام پر کچل دیا گیا۔

جب بھی کوئی معاشرہ بحران میں ہوتا ہے تو اس وقت دانشور، اور سیاستدان عوام کے بارے میں رومانوی خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور یہ امید کرتے ہیں کہ عوام اٹھیں گے، انقلاب آئے گا اور معاشرہ کو بدل دیا جائے گا۔

عوام کے بارے میں یہ رومانوی خیالات تاریخی طور پر غلط فہمی کا نتیجہ ہیں اس لئے عوامی طاقت وقوت کا اظہار کرتے ہوئے اس امید میں رہا جاتا ہے کہ یہ طاقت ابھرے گی اور حالات کو کنٹرول کرے گی۔

لیکن اس کے برعکس تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ عوام کو اوپر سے تعلیم دے کر اور کوشش کر کے ان میں سیاسی شعور بیدار کیا جائے، ایک غلط سوچ ہے۔ عوام خود اپنے نمائندے اور لیڈر ان کو منتخب کرتے ہیں کہ جو بدعنوان ہوتے ہیں اور جن کے بارے میں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے لئے کچھ نہیں کریں گے، لیکن اس کے باوجود وہ انہیں اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں، اور ان کی خاطر جان دینے کو تیار ہوتے ہیں۔

پاکستان میں نام نہاد جمہوریت کے آنے کے بعد سیاستدان برابر انتخابات میں منتخب ہوتے رہے ان کے بارے میں عوام کو معلوم ہے کہ وہ کرپٹ اور بدعنوان ہیں مگر اس کے باوجود وہ ان کی قیادت کو تسلیم کرتے رہے۔

ٹی وی کے ایک خبرنامے میں ایک علاقے کے مکینوں سے جب دریافت کیا گیا کہ وہ کس کو ووٹ دیں گے تو انہوں نے کہا کہ چاہے ہم کتنے ہی غریب کیوں نہ ہو جائیں، پانی و بجلی سے محروم ہو جائیں، ذلت کو برداشت کرنے پر مجبور ہوں مگر ہم

ووٹ روحانی پیر کو ہی دیں گے۔

جب لوگوں کی سوچ یہ ہو، اور خود ان میں تبدیل ہونے یا تبدیل کرنے کی خواہش نہ ہو تو اس صورت میں نا اہل اور بدعنوان لوگ ہی حکمرانی کرتے رہیں گے۔

اس لئے یہ کہنا کہ حکمراں طبقے عوام کو جاہل اور اَن پڑھ رکھتے ہیں، اگرچہ درست ہے مگر عوام بھی اس دلدل میں رہنا پسند کرتے ہیں، اور اس سے نکلنے کی خواہش نہیں رکھتے ہیں۔

آج کے زمانے میں لوگوں کو ملک کے حالات سے پوری طرح آگہی ہے اس لئے اگر وہ پڑھے لکھے نہیں ہیں، مگر معلومات ان تک پہنچتی ہیں، اور اگر ان میں تبدیلی کا جذبہ ہو تو اس کے اظہار کے بھی مواقع ہیں۔

اس لئے جب تک عوام میں خود سے اپنی زندگی کو بدلنے کی خواہش نہیں ہوگی، اس وقت تک وہ اس غربت، جہالت اور سیاستدانوں کے چنگل میں رہیں گے۔

پاکستانی معاشرے کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہاں دانشور اور عوام شاعروں سے بڑے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر شاعر انقلاب کی بات کرے تو لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے آپ کو بھلا دیتے ہیں، اگر ان انقلابی نظموں کو خوش آواز گلوکار مل جائے تو لوگ جھوم جاتے ہیں، مثلاً فیض صاحب کی نظم ''ہم بھی دیکھیں گے'' جو اقبال بانو گاتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ انقلاب آ گیا ہے، تاج اچھل رہے ہیں اور تخت گر رہے ہیں، مگر

جب جذبات سے نکل کر ہوش میں آتے ہیں تو وہی زندگی کی تلخیاں ہوتی ہیں اور وہی صاحب اقتدار اور ان کی رعونت۔

اس قسم کی شاعری بھی لوگوں کو نشہ میں مبتلا کر دیتی ہے، اور لوگ حقیقت سے فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ مثبت سوچ کے بجائے، ایک منفی ذہن کو پیدا کرتی ہے۔ یہ کوئی راستہ نہیں بتاتی ہے بلکہ ایک رومانس میں مبتلا کر کے اور زیادہ بے حس و بے جان بنا دیتی ہے۔

ہمارے ہاں اس قسم کی شاعری اس لئے مقبول ہے، کیونکہ کسی عمل اور جدوجہد کے بجائے، یہ خوابوں میں معاشرہ کو تبدیل کر دیتی ہے، اور وقتی طور پر لوگ خوش ہو جاتے ہیں کہ وہ وقت آنے والا ہے کہ جب ان کی حکمرانی ہوگی۔

تقسیمِ ہند اور پاکستانی معاشرہ

جب کوئی معاشرہ کسی بحران سے دوچار ہوتا ہے، جیسے جنگ، قحط اور انقلاب تو اس کے نتیجہ میں اس کا طبقاتی نظام ٹوٹ جاتا ہے، اور بحران کے خاتمہ پر اس کی ازسرنو تشکیل ہوتی ہے۔ وہ طبقات کہ جو مراعات یافتہ اور سماجی برتری کے حامل ہوتے ہیں، وہ اس عمل میں اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں، اور ان کی جگہ دوسرے افراد مراعات یافتہ اور صاحب اقتدار کی شکل میں آ جاتے ہیں۔

بحران کا ایک اور اثر یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کی روایات، اور اقدار ٹوٹ جاتی ہیں جس کی وجہ سے فوری طور پر انتشار، کنفیوژن، اور خلفشار کی صورت حال

ہوتی ہے، یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا ہے کہ جب تک ان کی جگہ دوسرے ادارے اور روایات نہ آ جائیں۔

اس انتشار میں کچھ لوگ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور کچھ اس سے فائدہ اٹھا کے دولت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔

اس تناظر میں جب ہندوستان کی تقسیم، اس کے عوامل، اور نتائج کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہ کس انتشار، بے چینی اور عدم تحفظ کا شکار ہوا۔

کانگرس اور مسلم لیگ کے راہنماؤں کا خیال تھا کہ تقسیم کے نتیجہ میں آبادیوں کی منتقلی نہیں ہوگی اور جو جہاں رہتا ہے وہ اسی طرح سے رہتا رہے گا۔ صرف سرحدوں کا تعین ہوگا اور دو ملک وجود میں آ جائیں گے۔ مگر حالات نے ان کی توقعات کے برعکس دوسری صورت اختیار کر لی۔ فرقہ وارانہ فسادات نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی جان کے تحفظ کے لئے ہندوستان یا پاکستان میں منتقل ہو جائیں۔ اس عمل میں انہیں اپنا گھر بار اور جائیدادوں کو چھوڑنا پڑا۔ اگرچہ اس کے اثرات کو پاکستان کے معاشرہ پر دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ ان نو واردوں میں دو قسم کے لوگ تھے: ایک وہ جو کہ فسادات کی وجہ سے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ دوسرے وہ تھے کہ جو نئے ملک میں اپنے لئے زیادہ معاشی فوائد دیکھ رہے تھے۔

پنجاب میں آنے والے تو فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے آئے، مگر سندھ میں آنے والے متوسط طبقے کے افراد وہ تھے جو ملازمت اور نئے معاشی مواقع کے حصول

کی وجہ سے آئے۔

تقسیم کا سب سے زیادہ اثر سندھ پر ہوا۔ کیونکہ یہاں ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ جو شہروں میں رہتا تھا، انہوں نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ان کا مستقبل اس ملک میں نہیں ہے لہٰذا یہاں سے ہجرت کر جانا چاہئے۔ ان کے جانے کی وجہ سے سندھ کے شہر کہ جن میں حیدرآباد، سکھر، لاڑکانہ اور شکارپور اپنے کلچر کی وجہ سے مشہور تھے، وہ ویران اور اجاڑ ہو گئے۔ ان کی جگہ لینے والے جو ہندوستان سے آئے، ان کے لئے سندھ کا ماحول نیا اور اجنبی تھا۔ وہ سندھ کی زبان اور کلچر سے ناواقف تھے۔ وہ جس ماحول کو چھوڑ کر آئے تھے، اس کی یادیں تو ان کے ساتھ تھیں، مگر وہ کلچر اس نئے ماحول میں پروان نہیں چڑھ سکتا تھا۔ لہٰذا یہ ایک بحرانی کیفیت تھی۔ آنے والوں کی ہندوستانی ثقافت ختم ہو چکی تھی، ان کی روایات اور اقدار بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئیں تھیں۔ خاندانی شرافت اور عظمت ختم ہو چکی تھی۔ وہ اس ماحول میں اجنبی تھے اور اپنے لئے کسی مقام کو حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

دوسری جانب سندھ کے باشندوں کے لئے ایک بڑی تعداد میں لوگوں کا آنا، اور شہروں میں آباد ہونا پریشان کن تھا۔ اس نے آبادی کے تناسب کو بگاڑ دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی زبان اور کلچر بھی خطرے میں پڑ گیا تھا۔ سندھ کے ہندوؤں کا سندھ کی زبان و ادب میں بڑا اہم کردار تھا۔ انہوں نے شہروں میں جدید کلچر کو پیدا کیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد سندھ کا معاشرہ اس کلچر سے محروم ہو گیا۔ ابتداء میں تو اس کو اتنا زیادہ محسوس نہیں کیا گیا، مگر جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اس کے ساتھ ہی انہیں احساس ہوتا چلا گیا کہ وہ اپنے ہی

صوبہ میں محاصرے کی حالت میں ہیں۔ اس نے ان میں گھٹن اور عدم تحفظ کے احساس کو پیدا کیا، اور اس نے آگے بڑھ کر دونوں کمیونٹیز میں اختلافات کو بڑھایا۔

دولت اور سماجی رتبہ

کسی بھی معاشرے میں اخلاقی اقدار اور روایات پر اس وقت عمل ہوتا ہے کہ جب اس میں ترتیب و تنظیم ہوتی ہے۔ معاشرہ کا دباؤ ہوتا ہے کہ افراد ان اقدار اور روایات پر عمل کرتے ہیں۔ جب یہ کمزور ہوتی ہیں، یا ٹوٹ جاتی ہیں، تو اس کے ساتھ ہی کرپشن اور بدعنوانیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

تقسیم کے بعد پاکستان کے معاشرے میں جو ایک اہم تبدیلی آئی وہ یہ کہ اب تک فرد کی شناخت اس کے خاندان اور طبقہ سے ہوتی تھی۔ جب اس بحران میں یہ سلسلہ ٹوٹ گیا، تو مقامی باشندوں میں تو شناخت کا یہ احساس رہا، مگر نووارد اس شناخت سے محروم ہو گئے۔ اگرچہ یہ دعوے ضرور کئے جاتے رہے کہ ان میں سے کئی کا تعلق امراء کے خاندانوں سے تھا اور وہ ہندوستان میں بڑی جائیدادیں چھوڑ آئے، مگر یہ سب ان کے دل کی تسلی کے لئے تھا۔ اس لئے ماحول میں ان کی شناخت محض ایک نووارد کی تھی۔

لہٰذا آہستہ آہستہ سماجی رتبہ بلند کرنے، معاشرے میں اہمیت حاصل کرنے، اور اپنی نئی شناخت کو بنانے کے لئے ایک ہی صورت تھی کہ کسی طرح سے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کی جائے اور اس کے سہارے معاشرے

میں باعزت مقام حاصل کیا جائے۔

جب دولت عزت، عظمت، اور شرافت کا معیار بنا تو اب اس میں سب ہی شریک ہو گئے۔ لہٰذا ہر جائز اور ناجائز طرح سے دولت کا حصول زندگی کا مقصد ہو گیا۔

اب معاشرے میں اس کی عزت ہونے لگی کہ جو امراء کی نئی بستیوں میں عالیشان مکانات میں رہتا ہو، جس کے پاس قیمتی کاریں ہوں، جو نئے فیشن کے ڈریس پہنتا ہو، اور جو دوستوں کی شاندار دعوتیں کرتا ہو۔

اس دوڑ میں ہر ایک کی یہ خواہش ہو گئی کہ وہ جلد از جلد امیر بن جائے اور اپنی زندگی ہی میں دولت حاصل کر کے اس سے لطف اندوز ہو۔ لہٰذا اسمگلنگ، ڈرگ کا کاروبار، پلاٹوں یا رئیل اسٹیٹ کا بزنس، وہ ذریعے تھے کہ جن میں راتوں رات پیسہ آیا اور لوگ دولت مند ہو گئے۔

دولت کے حصول کے اس جذبہ کے تحت بیوروکریسی میں کرپشن آیا۔ کیونکہ ان کے پاس اتھارٹی ہوتی ہے۔ لہٰذا بیوروکریسی کے کچھ شعبے ایسے ہیں کہ جنہیں سونے کی کان کہا جاتا ہے اور جہاں بغیر کسی کوشش کے خود بخود دولت کھنچ کر آتی ہے۔

تاجر طبقہ ملاوٹ اور رشوت کے ذریعے اپنے ناجائز کاروبار کو منافع بخش اور جائز بنانے میں مہارت رکھتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں کھانے پینے کی اشیاء، ادویات، مشینوں اور گاڑیوں کے پرزے سب نمبر دو کی شکل میں مل جاتے ہیں۔ نمبر دو کی اصطلاح اب اس قدر لوگوں کی زبان پر ہے کہ اس عمل کو درست سمجھ لیا گیا ہے۔

ملاوٹ اور نقلی کو اصلی بنانے میں یہ طبقہ اپنی پوری مہارت اور تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کرتا ہے۔ دوسری جانب انکم ٹیکس اور کسٹم کے لوگوں کو رشوت دے کر ٹیکس کی ادائیگی سے بھی بچ جاتا ہے۔

یوں کرپشن ہر طبقہ اور سطح سے آ گیا ہے۔ ڈاکٹرز کا تعلق ٹیسٹ کرنے والی لیبارٹریز سے ہوتا ہے۔ طالب علموں کا محقق سے ہوتا ہے، وکیلوں کا ججوں سے ہوتا ہے اور بدعنوانی بڑی خوش اسلوبی سے اپنا مقصد حاصل کرتی ہے۔

اب بدعنوان ہونے، یا کرپشن میں ملوث ہونے پر کسی کو شرمندگی نہیں ہوتی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے معاشرے میں ان کا بائیکاٹ نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے ان کی عزت واحترام میں کوئی فرق آتا ہے۔

اگر کبھی بدعنوانی کے خلاف کسی مہم کا آغاز ہوتا ہے تو تاجر اس بات پر اسٹرائیک کرتے ہیں کہ ان کی ملاوٹ یا قیمتوں کے بڑھانے یا ذخیرہ اندوزی پر کوئی اعتراض نہیں کیا جائے۔ طالب علم اس پر احتجاج کرتے ہیں کہ انہیں امتحان میں نقل کی آزادی ہونی چاہئے۔ وکیل اس پر شور مچاتے ہیں کہ ان کے خلاف کیوں فیصلہ ہوا۔ لہٰذا جب کرپشن اور بدعنوانی اس قدر سرایت کر جائے تو پھر اس کے خاتمہ کے لئے کوئی اخلاقی قدر باقی نہیں رہتی ہے۔

کرپشن اور بدعنوانی کو جائز بنانے اور معاشرے میں عزت وتوقیر حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ یہ لوگ حج کرتے ہیں، عمرے کی ادائیگی کے لئے بار بار جاتے ہیں۔ مسجدوں، یتیم خانوں اور مزاروں کو چندہ دیتے ہیں، صدقہ وخیرات کے ذریعہ

غریبوں میں نیک نام ہوتے ہیں۔

اس لئے کوئی یہ سوال نہیں کرتا کہ ان کی دولت جائز ہے یا ناجائز۔ اب یہ فرق ہو گیا ہے اور دولت کے سہارے یہ لوگ معاشرے میں نہ صرف ممتاز ہیں بلکہ باعزت اور قابل احترام بھی ہیں۔

شناخت

برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے شناخت کا عمل بدلتا رہا ہے۔ سلاطین اور مغلوں کے عہد میں ان کی شناخت توران، ایران کے حوالے سے تھی اور یہ ترک، مغل، ایرانی، عرب اور افغانی تھے۔ اس وقت تک ان کی مذہبی شناخت نہیں تھی۔

کولونیل دور میں ان کی مذہبی شناخت کو ابھارا گیا کہ جب انگریزی حکومت نے مردم شماری میں ہندو، مسلمان اور سکھ کو علیحدہ شناخت دی۔ جیسا کہ یورپ کے بارے میں بینڈکٹ اینڈرسن (Benadict Anderson) نے لکھا ہے کہ چھاپہ خانے کی ایجاد نے جب اخبارات، رسالے اور کتابیں شائع کرنا شروع کیں، تو اس کے پھیلاؤ نے یورپ کی قوموں میں قومیت کا احساس پیدا کیا۔ ہندوستان میں بھی اخبارات اور کتابوں کی اشاعت نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جو بکھرے ہوئے ہے، ان میں مسلم قومیت کے جذبات کو پیدا کیا۔

مذہبی شناخت کے اس ابھار میں، ان کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کیا

وہ پہلے مسلمان ہیں یا ہندوستانی۔ اسی احساس نے سیاست میں دو قومی نظریہ کو پیدا کیا۔

لیکن پاکستان بننے کے باوجود یہ سوال آج بھی پریشانی کا باعث ہے کہ کیا وہ پہلے مسلمان ہیں یا پاکستانی! اس سوال کی بڑی اہمیت ہے، اگر مذہبی شناخت کو اولیت دی جائے، تو قومی شناخت پیچھے رہ جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں قوم یا ملک کی اصلاح کرنا، اس کے لئے قربانی دینا، اور اس کی ترقی کے لئے جدوجہد کرنا، اہم نہیں رہتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو شناخت کی اس کمی کی وجہ سے ملک سے زیادہ ہمدردی نہیں ہے، خاص طور سے حکمراں طبقوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کو۔

قوم پرستی

پاکستان کے قیام کے بعد بھی دو قومی نظریہ کو برقرار رکھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی اقلیتوں کو قومیت سے خارج کر دیا گیا، جس کی وجہ سے پاکستان کی ریاست موجودہ دور کے نظریہ کے مطابق قومی ریاست نہیں رہی بلکہ مذہبی ریاست بن گئی۔

دوسرا اہم قدم جو اٹھایا گیا، اسے ہم ''ریاستی قوم پرستی'' کا نام دے سکتے ہیں۔ اس میں کہا گیا کہ پاکستان میں رہنے والے لوگوں کو اپنی علاقائی شناخت ختم کر دینی

چاہیئے اور خود کو پاکستانی سمجھنا چاہیئے۔

یہ ایک زبردست تضاد ہے، ایک طرف تو ریاست کو مذہبی شناخت دے کر عیسائیوں، ہندوؤں اور احمدیوں کو اس سے خارج کر دیا، دوسری طرف علاقائی یا صوبائی شناخت کو ختم کر کے پاکستانی شناخت پر زور دیا گیا، اور کہا گیا کہ صوبائی شناخت صوبائی تعصب پر مبنی ہے۔

لہٰذا یہاں بھی اسلامی شناخت اور پاکستانی شناخت میں الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ ایک طرف کہا گیا کہ ہم سب مسلمان ہیں، اور اس لحاظ سے ایک قوم ہیں، دوسری طرف غیر مسلموں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا۔ لیکن اسلامی شناخت ملک کے اتحاد کو قائم نہیں رکھ سکی، اور مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن کر آزاد ہو گیا۔

اسلامی اور پاکستانی شناخت اور قوم پرستی کی تبلیغ ریاست کی جانب سے کی گئی، مگر جب صوبائی حیثیت میں لوگوں کے مسائل حل نہیں ہوئے تو پاکستانی قوم پرستی کی جگہ صوبائی قوم پرستی نے لے لی۔ اس صورت میں علیحدگی کے نعرے بھی لگتے رہے جو ریاست کی ناکامی کا اظہار تھا۔

برادری اور قبائلی شناخت

جب مذہبی اور ریاستی قوم پرستی ناکام ہوئیں، اور لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا تو اس نے برادریوں کو منظم اور قبائلی شناختوں کو ابھارا۔ جب ریاست تعلیم، صحت اور روزگار دینے میں ناکام ہو گئی، تو برادریوں نے اپنے لوگوں کے لئے اسکول،

ہسپتال اور فلاح و بہبود کے ادارے کھولنا شروع کئے، جن کا تعلق قبیلوں سے تھا، ان کی وفاداری ان سے وابستہ ہو گئی ہے، لہٰذا اس کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں نے اپنے ناموں کے ساتھ برادری اور قبیلہ کا نام بطور شناخت استعمال کرنا شروع کر دیا، جس کا رواج اس سے پہلے اس قدر مقبول نہیں تھا نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اپنی برادریوں اور قبیلوں کی تاریخیں لکھوانا شروع کر دی ہیں تاکہ ان کو تاریخ میں اور اس کے ذریعہ سماج میں باعزت مقام مل سکے۔

قومی حمیت

ہمارے راہنما اپنی تقریروں میں بار بار قومی حمیت اور غیرت کی بات کرتے ہیں۔ جب کہ انہیں لوگوں نے حمیت اور غیرت دونوں کو عوام سے چھین کر انہیں مجبور اور بے بس بنا دیا ہے۔

قوموں میں حمیت اور غیرت اس وقت آتی ہے کہ جب معاشرے میں طبقاتی فرق نہ ہو، طاقت ور اور کمزور کا فرق نہ ہو، اور سماجی طور پر سب کو معزز سمجھا جائے، مگر اس سوسائٹی میں کہ جہاں امیر و غریب کا فرق ہو، جہاں صاحب اقتدار اور محروم طبقوں کے درمیان دوری ہو، ایک ایسے معاشرے میں طاقت ور اور صاحب اقتدار اپنے سے کم تر لوگوں کی روز بے عزتی کرتا ہے، ان کی غیرت و حمیت کا خاتمہ کرتا ہے۔ اس لئے ایک ایسے ماحول میں قومی غیرت اور حمیت کا پیدا ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اس کا اندازہ ہمیں اپنے روزمرہ کی زندگی میں ملتا ہے کہ جب اپنے سے کم تر لوگوں کو برے لہجہ، خراب اور درشت زبان میں مخاطب ہو کر ان سے بات کی جاتی ہے۔ ہماری زبان میں بھی یہ طبقاتی فرق موجود ہے۔ آپ کا استعمال برابر کے لوگوں سے ہوتا ہے، تم بے تکلفی کی علامت ہے جب کہ تو نوکروں اور غریب لوگوں کے لئے ہے۔

تخاطب کے اس استعمال سے لوگوں کو اپنے طبقاتی مرتبہ کا احساس ہو جاتا ہے اس لئے جب تک زبان کا یہ استعمال ہو گا، اس وقت تک طبقاتی فرق باقی رہے گا۔

قومی حمیت کا ایک اہم تعلق معاشی خوش حالی سے ہوتا ہے۔ اگر افراد معاشی طور پر آزاد ہوں، خود کفیل ہوں، اور کسی کے محتاج نہ ہوں، تو اس صورت میں وہ ضرورت کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔ لیکن اگر وہ غربت اور مفلسی کے عالم میں ہوں، تو اس صورت میں زندہ رہنے کے لئے حمیت و غیرت ختم ہو جاتی ہے اور لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ وہ امیروں کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ اس کا منظر ہم روز اپنے شہروں میں دیکھتے ہیں کہ جہاں چوراہوں پر بھیک مانگنے والوں کی ایک بڑی تعداد لوگوں کے پیچھے بھاگتی ہے۔

کسی بحران کی شکل میں، جیسے قحط، سیلاب، اور زلزلہ ہو تو ہم دیکھتے ہیں کہ امدادی سامان کے حصول کے لئے کس طرح سے لوگ ایک دوسرے کو کچلتے ہیں، اور جو زیادہ طاقت ور ہوتا ہے وہ سامان لوٹ کر لے جاتا ہے۔

لوگوں کی معاشی بدحالی اور مجبوری نے انہیں بھک منگا بنا دیا ہے۔ ہسپتال میں کام کرنے والے ہوں یا ہوٹلوں کے بیرے، وہ سب ٹپ کے امیدوار ہوتے ہیں۔

اور جب قومی حمیت اور غیرت کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں، تو اس کے ساتھ ہی عزت نفس اور اعتماد بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ افراد کو خوشامدی بنا دیتی ہے، جو اس امید پر امراء اور صاحب اقتدار لوگوں کے سامنے جھک جھک کر خوشامدانہ انداز میں بات کرتے ہیں کہ انہیں اس صلہ میں کچھ مل جائے۔

جب غیرت وحمیت کا خاتمہ ہو جائے تو انسان اندر سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل وخوار ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے ماحول میں جب راہنما ''قوم'' کی حمیت کی بات کرتے ہیں تو یہ بے معنی لگتی ہے۔ وہ قوم جسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا ہو، جسے توڑ پھوڑ کے ریزہ ریزہ کر دیا ہو، ایک ایسی قوم کو کیسے ''سیسہ پلائی ہوئی'' دیوار بنایا جا سکتا ہے، راہنماؤں کے یہ نعرے بے معنی ہو جاتے ہیں کہ جن کا کوئی تعلق حقائق سے نہیں ہوتا ہے۔ انہیں قوم کی اس وقت ضرورت پڑتی ہے کہ جب طبقاتی طور پر وہ کسی بحران میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر انہیں عوام کی قربانی چاہئے ہوتی ہے کہ جو ان کی جائیدادوں اور جان و مال کو تحفظ دے سکے۔

ایک طرف تو قومی حمیت کی بات کی جاتی ہے، مگر دوسری جانب معاشرے کے مختلف لوگ حمیت و غیرت کے ٹکڑے اڑاتے ہیں۔ دوکاندار حضرات چیزوں میں ملاوٹ کرتے ہیں، جعلی دوائیں تیار کرتے ہیں، اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کرتے ہیں، ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں، اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے انہیں نہ قومی حمیت کا

خیال ہوتا ہے اور نہ غیرت کا۔

اس طرح معاشرے کے دوسرے طبقے بدعنوانیوں میں ملوث ہیں، ڈاکٹرز مریضوں کو لوٹتے ہیں، تو وکیل موکلوں کو، اور اساتذہ طالب علموں کو۔

معاشرے کی غیرت وحمیت جاگتی ہے تو وہ عزت کے نام پر عورتوں کا قتل کرتے ہیں۔ ان کی حمیت وغیرت صرف عورتوں کے جسم میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

قومی فخر

قومی حمیت اور غیرت کے ساتھ ساتھ قومی فخر کی بات کی جاتی ہے۔ دراصل جس معاشرے میں ''قوم'' کی تشکیل ہی نہ ہو، اور قوم کا تصور برائے نام ہو، اس معاشرے میں نہ تو قومی حمیت کی بات کی جاسکتی ہے اور نہ قومی فخر کی۔ پاکستان کی صورت حال یہ ہے کہ یہ ایک ملک تو ہے مگر ایک قوم اب تک نہیں بن پائی ہے۔ اس لئے قومی شناخت ناپید ہے، اور جب قوم ہی کے وجود کو نہ مانا جائے تو پھر کیسی حمیت، کیسی غیرت اور کیا فخر۔

قومی فخر دو باتوں کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ میں جو قومیں فاتح کی حیثیت سے ابھریں، وہ اپنی فتوحات پر فخر کرتی ہیں۔ ان کے ہاں بہادری، شجاعت اور جواں مردی کا اظہار جنگ وجدل میں ہوتا ہے۔ فخر کا دوسرا ذریعہ علم وادب میں اضافہ اور تہذیبی طور پر ترقی میں ہے۔ ایسے معاشرے میں علماء، ادیب وشاعر، سائنسدان اور صاحب علم لوگوں کی قدر ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو کس بات پر فخر ہے۔ جہاں تک ان کی جنگ جوئی اور شجاعت و بہادری کا ذکر ہے تو اس مختصر سی تاریخ میں ہمیں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ ہم 1965ء کی جنگ کے حوالہ سے اپنے ہیروز کی بات کرتے ہیں، مگر یہ سلسلہ آگے نہیں چلتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک علم و ادب، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ایجادات اور ترقی کا سوال ہے، اس میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہمارا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اب کس بات پر فخر کیا جائے؟

لیکن ہمارے لوگ اپنے فخر کے لئے راستے تلاش کر لیتے ہیں۔ ہمارے قبائل اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہتھیار ان کا زیور ہے۔ وہ اپنے دشمن سے ضرور انتقام لیتے ہیں۔ ان کی شجاعت و بہادری کا مظہر ان کی آپس کی قبائلی لڑائیاں ہیں۔

ہمارے جاگیردار اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے پاس لامحدود زمینیں ہیں۔ ان کی قید میں ہاریوں کو قید رکھا جاتا ہے۔ وہ موروثی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مال و دولت اور جائیداد ان کے سماجی مرتبہ کو اونچا کرتی ہے۔

معاشرے کے دوسرے طبقے بھی اپنے فخر کی وجوہات تلاش کرنے میں ناکام نہیں ہوتے ہیں۔ آلِ سادات کو اپنی ذات پر فخر ہے، تو پٹھانوں کو اپنے خان ہونے پر، اب رہ گئیں دوسری ذاتیں تو وہ اپنے نسب و حسب کی تلاش میں تاریخ کے صفحات کھنگال ڈالتی ہیں، کوئی راجپوتوں کے اعلیٰ خاندان سے ہے، تو کوئی افراسیاب اور ساسانی خاندانوں کی اولاد ہے۔ اگر کوئی جماعت یا فرد اپنی شناخت کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو اس کے لئے معاشرے میں کوئی

درجہ نہیں ہوتا ہے۔

لہٰذا اس فخر و مباہات کے عالم میں، عالموں، سیاستدانوں، فلسفیوں، مفکروں اور علم و ادب کے ماہرین کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی ہے۔ کیونکہ یہ باعث فخر نہیں ہیں۔

سیاست اور جذبات

سیاستداں اور قومی راہنما، قوم کے نام پر لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ بدقسمتی سے اب تک پاکستان میں قوم کی تشکیل نہیں ہو پائی، کیونکہ جب مذہب کو اس کی بنیاد بنایا گیا تو مذہبی اقلیتیں قوم سے خارج کر دی گئیں اور قوم جس کا مقصد لوگوں اور جماعتوں کو جوڑنا ہوتا ہے، اس کے برعکس اس نے اس کو توڑنا شروع کر دیا۔ اس لئے جب ہم قومی راہنما کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو یہ محدود معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ وہ مذہبی اقلیتوں کے راہنما نہیں ہوتے ہیں۔ اس لئے ان اقلیتوں کو اپنے راہنما علیحدہ سے بنانا پڑتے ہیں، جو ان کے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔

ایک ایسے معاشرے میں کہ جہاں تعلیم کی کمی ہو، وہاں پُر جوش زبان اور لفاظی کے ذریعہ لوگوں کے جذبات کو ابھارا جاتا ہے۔ پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک ہم نے ایک خاص قسم کی جذباتی زبان کی تشکیل کی ہے جس کا اظہار جلسوں، جلوسوں اور اجتماعات میں ہوتا ہے۔

مثلاً یہ ہمیشہ سے کہا جاتا ہے کہ ملک ایک نازک دور سے گذر رہا ہے، یہ سازشوں کا شکار ہے، ہنود و یہود اور نصاریٰ اس ملک کو تباہ کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ اس کا جواب یوں دیا جاتا ہے کہ قوم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے۔ دشمن کو منہ توڑ جواب دیا جائے گا یا اس کے دانت کھٹے کر دیئے جائیں گے۔ قوم اپنی غیرت وحمیت کی خاطر جان قربان کردے گی، وغیرہ وغیرہ۔

زبان میں جذبات کا استعمال اس لئے ہوتا ہے کہ ہم اپنے مسائل کو عقلی اور استدلالی طور پر پرکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں شاعروں اور علماء وخطیبوں کی قدر ہے جو الفاظ سے کھیلتے ہیں اور لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں، اس کے برعکس ہمارے ہاں فلسفی اور مفکروں کی جگہ نہیں ہے کہ جو لوگوں میں عقلی شعور پیدا کرتے ہیں۔

اس جذباتیت کا نتیجہ ہے کہ فیصلے ہمیشہ غلط ہو جاتے ہیں۔ لوگ جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں، اور حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مسائل کا حل معاشرے کے سیاسی، ومعاشی اور سماجی تناظر میں ڈھونڈنے کے بجائے جذبات میں تلاش کیا جاتا ہے۔ کرپشن کے خلاف اگر مہم چلانی ہے تو دیکھنا ہے کہ یہ کیوں ہوتا ہے، اس کی سماجی وجوہات کیا ہیں، اس کے بجائے ہم مسئلہ کا حل یہ سمجھتے ہیں کہ کرپٹ لوگوں کو الٹا لٹکا دینا چاہیئے، انہیں سرعام پھانسی دینی چاہیئے۔ بدعنوانیوں کا حل محض سزاؤں میں نہیں ہوتا ہے۔ جب تک بدعنوانی کی بنیادوں کو ختم نہیں کیا جائے گا، سزائیں ان کو روکنے

میں ناکام رہیں گی۔تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب جائیداد لوگوں نے اپنی جائیدادوں اور املاک کے تحفظ کے لئے کڑی سزائیں رکھیں، مگر یہ جرائم اس لئے ختم نہیں ہوئے کہ لوگ غربت و افلاس کے ہاتھوں مجبور تھے کہ چوری کریں اور اپنا گذارا کریں، یہ جرائم اس وقت کم ہوئے کہ جب لوگوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں مہیا کی گئیں۔

یہی صورت حال پاکستان میں ہے۔روز بروز جرائم بڑھنے کی وجہ امیر وغریب کا بڑھتا ہوا فرق ہے۔ یہ فرق باقی رہا تو امراء بھی محفوظ نہیں رہیں گے اور نہ ان کی جائیدادیں ہی رہیں گی۔ان حالات میں محض سیاسی نعروں اور جذباتی زبان کے ذریعہ لوگوں کو اکٹھا نہیں کیا جا سکتا ہے۔غریب و مجبور، تعلیم سے محروم اور بیمار لوگوں کو جذبات سہارا نہیں دے سکتے ہیں۔

مجمع

جب ایک فرد اکیلا ہوتا ہے تو وہ کمزور ہوتا ہے، بے بس اور مجبور ہوتا ہے، اس کو آسانی سے قابو میں لایا جا سکتا ہے۔لیکن جب افراد مل کر مجمع کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو ان کا کردار بدل جاتا ہے۔کانیٹی (Caninti) نے اپنی کتاب ''مجمع اور طاقت'' میں اس کی نفسیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجمع ایک سمندر ہوتا ہے، خوں خوار موجوں کی طرح، آتش فشاں پہاڑ کی مانند اور آگ کے دریا کی مانند، جو اپنے ساتھ ہر شے کو بہا کر لے جاتا ہے، ہر شے کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

مجمع ایک طاقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جو قابو سے باہر ہو جاتا ہے، وہ اس قدر جذباتی اور مشتعل ہوتا ہے کہ خود پر قابو نہیں پاتا، اس میں ڈر اور خوف کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں، اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے، وہ انتقام کے جذبات سے بھرپور ہر شے کو تہس نہس کرنے پر تیار ہوتا ہے۔

پاکستان میں مجمع یہ شکل اس لئے اختیار کرتا ہے کیونکہ اس میں وہ لوگ شریک ہوتے ہیں کہ جو مجبور و بے بس ہوتے ہیں، جو دھتکارے ہوئے ہوتے ہیں، جن کا معاشرہ میں کوئی مقام نہیں ہوتا، جو غربت اور مفلسی کی زندگی گذار رہے ہوتے ہیں، اس لئے جب مجمع کی شکل میں انہیں طاقت ملتی ہے تو وہ اہل اقتدار اور صاحب جائیداد لوگوں کی ہر شے کو تباہ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

توڑ پھوڑ کے ذریعہ انہیں اپنی طاقت کے اظہار کا موقع ملتا ہے اور اس کے ذریعہ وہ حکمراں طبقوں پر اپنی حیثیت کی برتری کو قائم کرتے ہیں۔ لیکن جب مجمع بکھرتا ہے تو افراد ایک بار پھر اپنی تنہائی، علیحدگی اور کمزوری کی حالت میں واپس آ جاتے ہیں۔

انقلاب اور فساد

پاکستان کے معاشرے کو دیکھتے ہوئے، جب اس کا مقابلہ ماضی میں ان معاشروں سے کیا جاتا ہے کہ جہاں انقلابات آئے، جیسے فرانس، روس اور چین تو، یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں بھی انقلاب آنے والا ہے، اور معاشرہ کو تبدیل اب اصلاح کے

ذریعہ نہیں بلکہ انقلاب کے ذریعہ کیا جائے گا۔

لیکن تاریخ میں انقلاب کے قوانین نہیں ہیں کہ جن سے گذر کر یہ آتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تینوں ملکوں میں کہ جہاں انقلاب آیا، ان کے حالات اگرچہ کم وبیش ایک جیسے تھے مگر بنیادی طور پر ان میں فرق تھا۔ طبقاتی فرق، یعنی امیر وغریب کے درمیان بہت فاصلہ تھا، مراعات امراء کے طبقے میں محدود تھیں، جب کہ عوام کو تمام ٹیکسوں کا بوجھ ادا کرنا ہوتا تھا۔ ریاست کا نظام مطلق العنانیت پر تھا، کہ جس میں عوام کی نمائندگی نہیں تھی، ریاست اور اس کے اداروں پر آمدنی کا زیادہ حصہ خرچ کر دیا جاتا تھا، جیسے فوج، بیوروکریسی، وغیرہ، جب کہ عوام کی ترقی کے لئے ریاست کے پاس کچھ نہیں بچتا تھا۔ اگرچہ مقابلہ کریں تو پاکستانی معاشرہ اسی صورت حال سے دوچار ہے، مگر اس کے علاوہ ماضی کے ان معاشروں اور پاکستان کے معاشرے میں فرق ہے۔

مثلاً فرانس میں انقلاب سے پہلے دانش وروں کا طبقہ وجود میں آچکا تھا، جو سیاسیات، فلسفہ، تاریخ اور ادب میں نئے نئے اضافے کر رہے تھے۔ اس لئے جب انقلاب آیا ہے تو انقلاب کے راہنماؤں کے پاس ریاست کو تشکیل کرنے کے لئے خیالات وافکار کی کمی نہ تھی، انقلاب کے دوران جو دساتیر بنائے گئے، ان میں ان مفکرین کے نظریات شامل ہیں۔

دوسرے فرانس کے انقلاب میں بہت پہلے عملی حصہ پیرس کے عوام نے لیا، جب ایک مرتبہ عوامی طاقت نے ریاست کی طاقت سے ٹکر لے لی، تو اس کے بعد انقلاب

کے راہنما سامنے آنا شروع ہوئے، اس لئے انقلاب پہلے آیا، راہنما بعد میں آئے، اور انقلاب کے تین ادوار میں اس کے راہنما ایک ایک کر کے قتل ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخر میں نپولین نے انقلاب کا خاتمہ کر کے اپنی آمریت اور بعد میں شہنشاہیت کو قائم کرلیا۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ فرانس کے انقلاب نے جس روح کو پیدا کیا تھا، وہ جذبہ ختم نہیں ہوا اور فرانس 1830 اور 1848 میں انقلابات سے دوچار ہوا، اور بالآخر اس نے جمہوریت کے اداروں کو مضبوط کیا۔

روس کا انقلاب، فرانس کے مقابلہ میں مختلف تھا، یہاں زار کی استبدادی حکومت قائم تھی، بڑے بڑے جاگیردار تھے، کسانوں کی حالت غربت و مفلسی میں تھی۔ اس کی تصویر روس کے دانشوروں کے ادب اور شاعری میں ملتی ہے۔ نوجوان جو زار اور اس کی ریاست کے جابرانہ نظام سے تنگ تھے، انہوں نے دہشت گردی کا راستہ اختیار کیا تاکہ زار اور ریاست کے اہم عہدے داروں کو قتل کر کے اس نظام کا خاتمہ کر دیں، مگر ان کی یہ کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں، اور یہ نوجوان یا تو پھانسی پر لٹکا دیئے گئے، یا انہیں سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ لیکن 1914ء کی پہلی جنگ عظیم نے روس کی کمیونسٹ پارٹی کو یہ موقع دیا کہ وہ زار کے خلاف عوام کی طاقت کا مظاہرہ کریں، لہٰذا روس کا انقلاب ایک منظم پارٹی اور ان انقلابی راہنماؤں کی وجہ سے عمل میں آیا کہ جنہوں نے حالات کو دیکھتے ہوئے اقدامات کئے۔

یہی صورت حال چین کی ہے۔ چین انیسویں اور بیسویں صدیوں میں یورپی اقوام اور ان کی سامراجیت کا شکار تھا۔ چینی شاہی خاندان میں نہ تو صلاحیت باقی رہی

تھی، اور نہ ہی قابلیت کہ وہ ان سامراجی طاقتوں کا مقابلہ کرے، ان حالات میں چین میں قوم پرست اور سوشل ازم کی قوتیں ابھریں۔ ان کو متحد کرنے میں دوسری جنگ عظیم میں جاپان کا حصہ ہے کہ جس نے چین پر حملہ کر کے اس میں تباہی مچا دی تھی، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے قوم پرست اور کمیونسٹ دونوں اکٹھے ہوئے، اور بالآخر قوم پرستوں کو شکست دے کہ کمیونسٹ کامیاب ہوئے، اس کامیابی میں بھی ایک منظّم پارٹی، اور باصلاحیت راہنماؤں کا حصہ تھا۔

اگر اس صورت حال کا پاکستان سے مقابلہ کیا جائے، تو نہ تو ہمارے دانشوروں نے معاشرے کی صورت حال کو سمجھتے ہوئے کوئی نئے خیالات و نظریات پیدا کئے ہیں، اور نہ ہی یہاں ایسی منظّم جماعت اور اس کے دانش ور راہنما ہیں کہ جو حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے انقلاب کا راستہ اختیار کریں۔

لہٰذا انقلاب کے برعکس ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگوں کا غم و غصہ فسادات اور اپنے مطالبات کے سلسلہ میں مظاہروں کی شکل میں نظر آتا ہے۔ ان مظاہروں میں لوگ اپنی بے چینی اور خودی کا اظہار توڑ پھوڑ اور املاک کو تباہ و برباد کر کے کر رہے ہیں۔ لیکن یہ فسادات وقتی ہوتے ہیں، یا تو یہ پولیس کے ذریعہ ختم ہو جاتے ہیں، اور یا خود عوام جب اپنا غصہ نکال لیتے ہیں، تو ان کے جذبات ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، اور یہ سلسلہ بغیر کسی مقصد کے ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فسادات کسی تبدیلی کا ذریعہ نہیں بنتے ہیں، بلکہ ریاست ان کو بہانہ بنا کر طاقت و قوت کے ذریعہ خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتی ہے، اور حکمراں طبقے ان ذرائع کو استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ جو ان کی

جان و مال کو تحفظ دے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں ان کی آبادیاں علیحدہ اور محفوظ علاقوں میں آباد ہو رہی ہیں، یا ان کی حفاظت کے لئے ریاستی اداروں کے ساتھ ساتھ نجی سیکورٹی ادارے وجود میں آ رہے ہیں۔ وہ عام لوگوں سے کٹ کر اپنی علیحدہ دنیا میں آباد ہو رہے ہیں، جس کی وجہ سے ان میں اور عوام میں رابطوں کی کمی ہو رہی ہے۔ یہ وہی صورت حال ہے کہ جس کا اظہار کولونیل دور میں انگریز حکمراں طبقے کا تھا۔

عوام کی بے چینی اور فسادات کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ریاست اور اس کے ادارے اپنی تمام توانائی ان کو کچل دینے میں صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فسادات ملک کی روزمرہ کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں، اور اس کی معیشت پر اثر انداز ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ معاشرے کی پس ماندگی کی صورت میں نکلتا ہے۔

پس ماندگی

کسی بھی معاشرے کی ذہنی پس ماندگی، معاشی پس ماندگی سے زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ اگر ذہن بند ہو جائے، نئے خیالات وافکار کی تخلیق نہ ہو، اور تبدیلی کے لئے راستہ ہموار نہ ہو تو اس صورت میں معاشرہ ایک جگہ ٹھہر کر رہ جاتا ہے۔

ذہنی پس ماندگی کی ایک اہم وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب معاشرے کے افراد میں عقائد کی پختگی ہو، اور یہ ان کے مقابلہ میں علم کے حصول کے لئے توجہ نہ دی جائے تو

عقائد علم کی تحقیر کرتے ہیں، اور نہ تو اس کی تخلیق میں حصہ لیتے ہیں اور نہ ہی جو اس میں اضافے ہو رہے ہیں، ان کے حصول میں دلچسپی لیتے ہیں۔

پاکستان کا معاشرہ اس صورت حال سے دوچار ہے۔ اس وجہ سے روایت کی جڑیں اس قدر گہری ہیں کہ اس میں تبدیلی کے امکان کم نظر آتے ہیں۔ لہٰذا جب معاشرے میں نئی ٹیکنالوجی آتی ہے تو یہ اسے اور زیادہ پس ماندہ بنا دیتی ہے۔ ترقی شدہ معاشروں میں ٹیکنالوجی انہیں آگے بڑھاتی ہیں۔ اول تو جب ترقی پذیر یا ترقی شدہ معاشرے جب ٹیکنالوجی میں اضافہ کرتے ہیں، اور نئی ایجادات کرتے ہیں تو یہ ان کی ترقی میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

ان کے مقابلہ میں جو معاشرے ان کی ایجادات میں حصہ نہیں لیتے ہیں اور انہیں محض اختیار کر تے ہیں، تو ان کا استعمال بھی وہ اپنے پس ماندہ ذہن کے ساتھ کرتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں کمپیوٹر یا انٹرنیٹ کا استعمال علم کے حصول کے لئے نہیں ہوتا ہے، بلکہ اُن کو یا تو تفریح کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، یا ان کے ذریعہ جرائم میں حصہ لیا جاتا ہے۔ کیسٹ اور سی ڈیز میں زہر انگیز تقاریر کو ریکارڈ کر کے مذہبی جماعتیں اپنے نظریات کا پروپیگنڈا کرتی ہیں۔ ٹی وی کے ذریعہ بھی لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھارا جاتا ہے اور انہیں بیوقوف بنا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

لہٰذا ایک پس ماندہ معاشرہ میں نئی ٹیکنالوجی ہو یا پرانی، اس کا استعمال کر کے پس ماندہ قوتیں اور زیادہ مؤثر ہو جاتی ہیں، اور پس ماندگی کی جڑیں پہلے سے زیادہ گہری ہو جاتی ہیں۔

دانش ور اور پس ماندگی

ایک پس ماندہ معاشرہ میں دو قسم کے دانش ور ہوتے ہیں، اول وہ جو قائم شدہ روایات اور اس کے اداروں کی حمایت کرتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنی تحریروں کے ذریعہ انہیں درست اور صحیح ثابت کیا جائے، ان کے مقابلہ میں وہ دانش ور بھی ہوتے ہیں کہ جو سمجھتے ہیں کہ معاشرے کی پس ماندگی کی وجہ فرسودہ روایات، رسومات اور رواج ہیں، اس لئے انہیں تبدیل ہونا چاہیئے۔

معاشرہ کی اکثریت ان دانشوروں کی پذیرائی کرتی ہے کہ جو روایات کے حامی ہوتے ہیں، ان کا احترام کیا جاتا ہے، انہیں مالی فائدے پہنچائے جاتے ہیں، اور وہ قدامت پرست حلقوں میں ہر دل عزیز ہوتے ہیں۔

ان کے مقابلہ میں ترقی پسند دانشوروں کو اکثریت اپنا مخالف اور دشمن تصور کرتی ہے اور انہیں معاشرہ میں علیحدہ کر کے ان کے خیالات و افکار کو رد کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ معاشرہ میں باغی ہوتے ہیں، اور باغیوں کو سزا دی جاتی ہے، ان کا احترام نہیں کیا جاتا ہے۔

لہٰذا پاکستان میں قدامت پرست دانش ور اہمیت رکھتے ہیں، جب کہ ترقی پسندوں کو ملک دشمن اور غدار کہہ کر ان سے نفرت کی جاتی ہے۔ اس صورت حال میں ٹیکنالوجی کی طرح قدامت پرست دانشور معاشرے کو اور زیادہ پس ماندہ بناتے ہیں اور تبدیلی کے راستوں کو بند کرتے ہیں۔

جاگیرداراور قبائلی سردار

پاکستان میں جاگیردار اور قبائلی سردار طاقتور اور بااثر ہیں، ان کی طاقت اور اثرورسوخ کی وجہ قدیم روایات اور رسم ورواج ہیں کہ جن کے ذریعہ انہیں اتھارٹی ملتی ہے۔ یہ اپنے علاقوں میں تمام اختیارات رکھتے ہیں اور ریاست اور اس کے قوانین ان کی حدود میں بے معنی ہو جاتے ہیں۔

جب آمرانہ طرزِ حکومت ہوتا ہے تو اس وقت یہ آمر کے ساتھ ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں اپنی حیثیت اور پوزیشن کو مضبوط رکھنے کے لئے اقتدار میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جب جمہوریت آتی ہے تو یہ لوگ الیکشن میں جیتتے ہیں کیونکہ مزارعین اور ہاری ان کے علاوہ کسی اور کو ووٹ دے ہی نہیں سکتے ہیں، اس لئے چاہے یہ کسی بھی سیاسی جماعت میں ہوں، ان کی جیت لازمی ہوتی ہے۔ لہٰذا تمام سیاسی جماعتیں کوشش کرتی ہیں کہ وہ انہیں اپنے ساتھ شامل کریں۔ اس صورت حال میں معاشرے میں کسی نظریاتی سیاست کی گنجائش نہیں ہوتی ہے، بلکہ سازش اور گٹھ جوڑ کے ذریعے حکومتیں بنائی جاتی ہیں۔

اقتدار میں رہنے کی وجہ سے حکومت اور ریاست کی تمام مشینری اور ادارے ان کے ماتحت ہوتے ہیں، جنہیں وہ اپنے ذاتی اقتدار کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا جمہوریت کی صورت میں یہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہو جاتے ہیں، اور عوام ان کے سامنے بے بس اور مجبور ہوتے ہیں۔

چونکہ یہ اقتدار میں ہوتے ہیں لہٰذا پارلیمنٹ میں نہ تو زرعی اصلاحات ہو سکتی ہیں، اور نہ ہی ایسی اصلاحات جوان کی اتھارٹی کو چیلنج کریں۔ اس صورت حال میں جاگیرداری اور قبائلی سرداری نظام کا خاتمہ مشکل نظر آتا ہے۔ ان کی موجودگی میں معاشرہ پس ماندہ اور بچھڑا ہوا رہے گا۔ کیونکہ یہ ان کے مفاد میں ہے کہ لوگ جاہل رہیں، اور غربت و مفلسی کی حالت میں ان کے محتاج رہیں۔ اس لئے یہ لوگ روایت کے نام پر عورتوں کو قتل بھی کرتے ہیں، ان کے حقوق کو کچلتے ہیں اور اپنے علاقوں کو زیادہ سے زیادہ پسماندہ رکھتے ہیں۔

تعلیم اور پس ماندگی

اگرچہ تعلیم کا مقصد روشن خیالی اور آگہی پیدا کرنا ہے، مگر اس تعلیم کو جب حکمراں ادارے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں تو ایسا نصاب ترتیب دیتے ہیں کہ وہ لوگوں کو تنگ نظر، انتہا پسند، اور روایت پسند بناتا ہے۔ پاکستانی ریاست تعلیم کو جس مقصد کے لئے استعمال کر رہی ہے، اس میں نوجوانوں کو محبِّ وطن بنانا، اور نظریاتی طور پر ایک نظریہ کی سچائی پر یقین دلانا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت علم کے پھیلاؤ اور جس طرح سے علم کو سچائی کی تلاش اور معاشرے کو سمجھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس سے ہمارا تعلیمی نظام محروم ہے۔

تعلیمی اداروں کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ علم کو پیدا کرے، نئے خیالات و افکار کو فروغ دے۔ مگر ہمارے تعلیمی ادارے علم تخلیق کرنے کے بجائے تقلید

کرر ہے ہیں، جو علم اس وقت دنیا کے دوسرے تعلیمی اداروں میں پیدا ہو رہا ہے، اس کو دھرا رہے ہیں، ان کا اپنا حصہ علم کی تحقیق اور تخلیق میں نہیں ہے۔

دوسرا المیہ یہ ہے کہ علم کا مقصد امتحان میں کامیابی ہے، لہٰذا اتنا سیکھا جاتا ہے کہ جو اس میں مدد کرے۔ اس کے علاوہ علم کے حصول وقت کا زیاں سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس محدود علم کے لئے گائیڈ بکس بازار میں موجود ہیں کہ جو امتحان میں کامیابی کی گارنٹی دیتی ہیں، طالب علم انہیں پر انحصار کرتے ہیں اور امتحان میں پاس ہو جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں تعلیم یافتہ طبقہ خیالات و افکار کے لحاظ سے اور زیادہ پس ماندہ ہے کیونکہ انہیں نصابی کتب اور ریاست کی جانب سے دیا ہوا مواد ان کی پس ماندگی کو سہارا دیتا ہے۔ یہ انہیں اور زیادہ قدامت پرست بنانے میں مدد دیتا ہے۔

دانش ور اور پس ماندگی

عام طور سے کسی بھی معاشرے میں دانشوروں کا کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ توہمات، تشدد، عدم رواداری اور ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، ان کی موجودگی لوگوں کو حوصلہ دیتی ہے کہ وہ ان کے حقوق کے لئے جدوجہد کریں گے اور ان روایات کو چیلنج کریں گے کہ جو معاشرے کو پس ماندہ رکھے ہوئے ہیں، مگر پاکستانی دانشور اس کے برعکس کام کر رہا ہے۔ اپنے علم اور دانش کو اپنے ذاتی مفادات کے لئے فروخت کرتا ہے اور دولت و عہدوں کے حصول کے لئے اپنے قلم کو بیچ ڈالتا ہے۔ جب معاشرے میں آزادانہ دانشورانہ روایات ختم ہو جائیں تو اس صورت میں معاشرہ بھی کھوکھلا ہو

جاتا ہے۔ پاکستان میں مذہبی علماء اور شعراء کے علاوہ کسی اور کو دانشور بھی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ لوگ مشاعروں میں ان کے اشعار سے لطف اندوز ہوتے ہیں، یا علماء کے وعظوں اور خطبات سے متاثر ہوتے ہیں اور سکون و اطمینان کے ساتھ گھروں کو چلے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں فلسفیوں اور سماجی علوم کے ماہرین کی کمی ہے، یا کہا جائے کہ فقدان ہے۔ اس لئے یہاں کوئی نئے نظریات، خیالات اور افکار تخلیق نہیں ہوتے ہیں، اور معاشرہ قدیم روایات کو زندہ رکھے ہوئے ان کو تقدس کا درجہ دیدیتا ہے۔

ذہنی پس ماندگی اسی وقت دور ہوتی ہے کہ جب قدیم روایات کو چیلنج کیا جاتا ہے، اور ان کی جگہ حالات کے مطابق نئی روایات کو پیدا کیا جاتا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں یہ عمل رک جائے تو اس صورت میں وہ ایک جگہ ٹھہر کر رہ جاتا ہے۔

ذرائع ابلاغ اور پس ماندگی

اخبارات، ریڈیو، ٹی وی اور انٹرنیٹ وہ ذرائع ہیں کہ جن کو استعمال کر کے دنیا میں ہونے والی سائنسی تحقیقات، اور نئے علوم اور ان کے فروغ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ اگر ان ذرائع کو ریاست یا معاشرہ اس مقصد کے لئے استعمال کرے کہ ان کے ذریعہ وہ اپنے نظام کی برتری اور اپنے نظریہ کی بالادستی کو ثابت کرے، تو اس صورت میں ذہن کو کشادہ کرنے اور نئے علوم کے حصول کو چھوڑ کر لوگوں کو من گھڑت اور جھوٹی اطلاعات دیتے ہیں، اور انہیں دنیا میں ہونے والے

واقعات سے بے خبر رکھتے ہیں۔

ہمارے ذرائع ابلاغ اوران کے تجزیہ نگارلوگوں کوگمراہ کرنے میں مصروف ہیں، اورحقائق کو چھپا کرانہیں محض جذبات کے سہارے اپنا ہمنوا بنانے میں مصروف ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ لوگوں میں شعوراورآ گہی کے بجائے، ان میں تنگ نظری اور جذباتیت کو پیدا کررہے ہیں، اس لحاظ سے یہ جو معلومات لوگوں کوفراہم کر رہے ہیں، وہ معاشرے کواور زیادہ پس ماندہ بنارہی ہے۔

روایات اور جدیدیت

پاکستانی معاشرے میں روایات اور جدیدیت کے درمیان ایک تصادم اور کش مکش جاری ہے اسے قدامت پرستی اور ترقی پسندی کے مفہوم میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔روایت کے پس منظر میں نہ صرف ماضی، اس کی تاریخ، آباؤ اجداد کے تجربات اور مذہبی وسماجی جذبات ہوتے ہیں، جو اسے تقدس کا درجہ دیدیتے ہیں۔اس لئے اس کی جڑیں معاشرے میں بہت گہری ہوتی ہیں اور لوگ ان کے سحر میں مبتلا رہتے ہیں روایت کوتوڑنا یا اسے ختم کرنے کا مطلب ہوتا ہے کہ اس تاریخی تسلسل کوروک دیا جائے جو معاشرے میں جاری وساری ہے۔

اس کے برعکس جدیدیت کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے، اس کا ماضی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا ہے، یہ معاشرے کوزمانے کے تقاضوں کے تحت بدلنا چاہتے ہیں۔اس لئے جدیدیت میں کوئی تقدس، رومانیت اور سحرنہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تبدیلی کی خواہش کو

بیدار کرتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ ان روایات سے چھٹکارا پایا جائے کہ جن کی افادیت ختم ہو چکی ہے اور جو تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

پاکستان میں قدامت پرست یا روایت پسند طبقہ زیادہ مضبوط ہے، وہ تبدیلی کے مخالف ہیں، خاص طور سے خیالات و افکار کی تبدیلی کہ جو ذہن کو بدلتے ہیں، اگر وہ ٹیکنالوجی کو اختیار کرتے ہیں، تو اسے بھی قدامت پرستی میں ڈھال لیتے ہیں۔

اس وجہ سے ہمارے ہاں یہ رویہ عام ہے کہ جدیدیت مغربیت ہے، اور ہمارے کلچر کے خلاف ایک سازش ہے، وہ اسے ثقافتی حملہ یا یلغار تصور کرتے ہیں اور اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ مسائل کا حل روایات میں ڈھونڈیں، اور جدیدیت سے انکار کریں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ وقت کے تقاضوں، ضروریات اور چیلنجوں کو نظر انداز کر کے ماضی میں پناہ لینا چاہتا ہے اور ان روایات کا احیاء چاہتا ہے کہ جو اسے اور زیادہ پس ماندہ بنا رہی ہیں۔ اگر معاشرے میں تبدیلی کی خواہشات کم ہو جائیں، یا ختم ہو جائیں، تو اس صورت میں ترقی کے راستے بھی بند ہو جاتے ہیں۔

تشدد اور دہشت گردی

وقت کے ساتھ پاکستان میں تشدد کے رجحانات بڑی تیزی سے ابھرے ہیں، ساتھ ہی میں دہشت گردی کے واقعات ہیں کہ جن میں خودکش حملے ہوتے ہیں، اور عام لوگ ان کا نشانہ بنتے ہیں، دہشت گردوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ملک میں انتشار،

بے چینی اور عدم تحفظ کے جذبات پیدا ہوں۔

دہشت گردی اس وقت مذہبی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ جب ایک فرقہ خود کو سچا اور راہِ راست پر سمجھتا ہے اور دوسرے فرقوں کو گمراہ۔ گمراہ لوگوں کو راہِ راست پر لانے کا ایک ذریعہ تبلیغ ہوتی ہے، مگر یہ اس کے قائل نہیں، اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کا قتل عام کیا جائے تا کہ یہ لوگ ڈر اور خوف کی حالت میں رہیں، اور ان کو کسی بھی سطح پر چیلنج نہیں کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ قتل عام کے ذریعہ ان کی عددی طاقت کو کم کر دیا جائے، تا کہ وہ سیاسی اور معاشی طور پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں۔

لیکن دہشت گردی اور تشدد کی کئی شکلیں ہیں۔ اپنے مخالفوں کو اغواء کر کے انہیں پہلے اذیت دینا اور پھر ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بوریوں میں بند کر کے شاہراہوں پر پھینکنا ایک بیمار نفسیاتی ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔

دوسری طرف ریاستی سطح پر پولیس اور جاسوسی اداروں میں تشدد عام ہے۔ روز اس قسم کی خبریں آتی ہیں کہ تھانوں میں لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان کی لاشوں کو ورثاء کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

اس لئے تشدد اور دہشت گردی معاشرے کے ہر طبقے اور گروہ میں سرایت کر چکی ہیں، لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر پاکستان کے معاشرے میں یہ تشدد اور دہشت گردی کیوں ہے؟ جیسا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم دوسرے مذہبی فرقوں کے عقائد کا احترام نہیں کرتے ہیں، اور انہیں راہ سے بھٹکا ہوا سمجھ کر ان کے خلاف ہو جاتے ہیں، اس سلسلہ میں علماء کی تقاریر، ان

کی کتابیں، اور پمفلٹس لوگوں کے دلوں میں نفرت اور غصہ کے جذبات پیدا کرتے ہیں، اور وہ اس پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ اپنی سچائی کے لئے دوسروں کی جان لے کر ثواب حاصل کریں۔

دوسری طرف سیاسی جماعتوں میں اپنے حریفوں کے خلاف بڑا غصہ ہوتا ہے، اور اپنی بالادستی کو قائم رکھنے کے لئے اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھایا جائے، ان میں خوف و ہراس پیدا کیا جائے، تاکہ وہ خاموش ہو کر مقابلہ سے دستبردار ہو جائیں۔

ریاستی دہشت گردی کے پس منظر میں حکمران طبقوں کا اثر ورسوخ اور اختیارات ہوتے ہیں انہیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ان کا قبضہ لوگوں کے جسموں پر ہے، اور اس سلسلہ میں وہ قانون کی زد سے بھی باہر ہوتے ہیں، لہٰذا تشدد اور دہشت گردی ان کی شخصیات کو ابھارتی ہے، لوگوں کو دہشت زدہ کر کے انہیں اطمیان و مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

لہٰذا اس تشدد اور دہشت گردی کے پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی رشتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے، نہ ہی انسان کے جذبات و احساسات کو دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ اس میں بے رحمانہ اور ظالمانہ انسان ابھر کر آتا ہے جو ثواب کی خاطر، سیاسی برتری کے لئے اور اپنے اختیارات کو ثابت کرنے کے لئے لوگوں کو تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔

اس تشدد اور دہشت گردی کے رشتے آپس میں ملے ہوتے ہیں۔ خاندان میں

والدین بچوں کو اطاعت گذار بنانے کے لئے اسے استعمال کرتے ہیں، مدرسوں اور اسکولوں میں اساتذہ طالب علموں پر کنٹرول کے لئے سزا اور اذیت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس کے پاس طاقت وقوت اور اختیار ہوتا ہے وہ اپنی بالادستی کے لئے انہیں استعمال کرتا ہے اور تشدد کے ذریعے پُر زور اور زبردست لوگوں کو اپنا مطیع وفرماں بردار بناتا ہے۔

دہشت گردوں کے فروغ پانے کی ایک وجہ جمہوری روایات اور اداروں کی کمزوری ہے۔ جب جماعتوں اور گروپ کے لئے دستوزی راستے بند ہو جاتے ہیں تو وہ اس کو اختیار کر کے اپنی آواز بلند کرتے ہیں، اور اس کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر ان کے حقوق کی پامالی ہوتی ہے تو وہ پورے معاشرے کو اس کی سزا دیں گے۔

تشدد اور اذیت کے خلاف اس لئے آواز نہیں اٹھتی ہے کہ اس پر احتجاج نہیں ہوتا ہے۔ تھانوں میں مرنے والوں کے رشتہ دار اور برادری کے لوگ تو باہر آجاتے ہیں، مگر معاشرے کے دوسرے لوگ خاموش رہتے ہیں۔ جب یہ واقعات روز ہونے لگیں تو لوگ انہیں معمول کے مطابق سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں، اس وجہ سے دہشت گردی اور تشدد کو معاشرہ قبول کر لیتا ہے۔

جناح کا پاکستان

آج کل یہ آواز بار بار سنائی دے رہی ہے کہ پاکستان کو جناح کے تصور کے مطابق تشکیل دیا جائے۔ لیکن اس کی پوری طرح سے وضاحت نہیں ہو رہی ہے کہ

جناح کا تصورِ پاکستان کیا تھا؟

یہاں پر ایک سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے وہ یہ کہ پاکستان کے خیالات و افکار پر اقبال اور جناح کے خیالات وافکار کا تسلط ہے۔ جو سیاستدان یا دانشور اس کو بار بار دہراتے ہیں، وہ اس کو بھول جاتے ہیں کہ دنیا ایک جگہ ٹھہری ہوئی اور جامد نہیں رہتی ہے یہ برابر متحرک رہتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئی ضروریات پیدا ہوتی ہیں، نئے تقاضے جنم لیتے ہیں اس لئے ان کے حل کے لئے معاشرے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ نئے خیالات وافکار پیدا کرے تاکہ نئی صورت حال کا مقابلہ کیا جا سکے۔

اب جو لوگ اقبال اور جناح کے خیالات یا تصورِ پاکستان کو واپس لانا چاہتے ہیں، انہیں یہ سوچنا چاہیئے کہ آج کا پاکستان نہ اقبال کے زمانہ کا ہے اور نہ جناح کے عہد کا۔ یہ بدلتا ہوا پاکستان ہے کہ جس کی تشکیل کے لئے نئے نظام اور نئے افکار کی ضرورت ہے۔ چونکہ ہمارے دانشور اس قابل نہیں کہ وہ اس عہد کو سمجھ سکیں، اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق نئے نظام کی تشکیل کر سکیں، تو وہ اپنی اس کم مائیگی کا حل اس میں ڈھونڈتے ہیں کہ ماضی میں جا کر ان افکار کو زندہ کریں کہ جو اپنا وقت پورا کر کے ختم ہو چکے ہیں۔ تاریخ میں ماضی کا احیاء نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی قدیم افکار کی بنیاد پر نئے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اگر جناح کا پاکستان کے بارے میں کوئی تصور تھا تو وہ وقت کے ساتھ ختم ہو گیا ہے، اب اس کی جگہ نئے وژن کی ضرورت ہے جو آج کے گلوبل دور میں پاکستان کو کوئی مقام دے سکے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہم مسائل کا حل شخصیات میں ڈھونڈتے ہیں، اور افراد کے تناظر میں معاشرہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس طرح ناموں کے ذریعہ لوگوں کے جذبات کو تو ابھار دیتے ہیں مگر مسائل کا حل نہیں ملتا ہے۔ ملک کسی ایک شخصیت کے سہارے نہیں چلتا ہے، اور نہ وہ کسی ایک فرد کی جاگیر ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کا ملک ہوتا ہے، اور اس کو لوگوں کی خواہشات اور امنگوں کے پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔ جناح کا پاکستان سے یہ تصور ابھرتا ہے کہ شاید یہ ملک ان کی جاگیر اور جائیداد تھا اور جو کچھ وہ سمجھتے تھے، اس پر اس ملک کو ہمیشہ کے لئے چلنا چاہیئے۔ یہ ایک گمراہ کن تصور ہے جو جمہوری سوچ اور روایت سے دور کر دیتا ہے اور معاشرہ شخصیت کے سحر میں مبتلا ہو کر ان کے سہارے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس کی اپنی توانائی اور طاقت ختم ہو جاتی ہے اور وہ شخصیت سے امید رکھتا ہے کہ وہ اس کو ہر بحران سے نکالے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جذبات سے کھیلنے والے اور ان کو ابھارنے والے لیڈر پیدا ہو جاتے ہیں، جو لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے اپنے ذاتی مفادات کو پورا کرتے ہیں۔

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کی پوری سیاست شخصیتوں کے گرد گھومتی ہے نظریات کی اس میں گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔ سیاسی جماعتیں بھی نظریات کے بجائے لیڈروں کی شخصیت کے زیر اثر رہتی ہیں۔ اس صورت حال میں تبدیلی کے امکانات کم سے کم ہو جاتے ہیں۔ شخصیات بدلتی رہتی ہیں، نظام وہی رہتا ہے، مسائل وہی رہتے ہیں، اور لوگوں کے لئے آگے بڑھنے اور ترقی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔

نظریاتی مملکت

نظریاتی مملکت یا ملک کا تصور جدید ہے۔ اس سے پہلے ریاست کا تعلق بادشاہت اور شاہی خاندان سے ہوتا تھا۔ تاریخ میں شاہی خاندان سے اس دور کو موسوم کیا جاتا تھا جیسے مغلیہ عہد یا عباسی دور۔ لیکن جب بادشاہی دور ختم ہوا، ریاست کا کریکٹر بدلنا شروع ہوا، جمہوریت کے ساتھ ساتھ ریاست کا ڈھانچہ بھی بدلا، اور اب ریاست جمہوری ہو گئی۔ جمہوریت میں سیاسی جماعتوں کے مختلف نظریات ہوتے ہیں، ان میں قدامت پرست بھی ہوتی ہیں، اور ترقی پسند بھی۔ اس لئے ریاست کسی ایک نظریہ کی پابند نہیں ہوتی ہے، اس میں جماعتوں کے اقتدار میں آنے سے اس کی پالیسی بدل جاتی ہے۔

لیکن ریاست اس وقت نظریاتی ہو گئی جب فرانس میں انقلاب آیا، اور اس کا کریکٹر انقلابی ہو گیا۔ اس انقلاب نے نہ صرف فرانس کو نظریاتی یا انقلابی ریاست بنایا، بلکہ فرانسیسی انقلابیوں نے پورے یورپ کو اس نظریہ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ کے دوسرے ملک خوف زدہ ہو گئے اور انقلاب کی راہوں کو بند کرنے کے لئے متحد ہو گئے۔ لیکن اس انقلاب نے آہستہ آہستہ یورپ کو متاثر کیا اور یورپی ملکوں میں خاندانی بادشاہتیں، دستوری بادشاہتیں ہو گئیں۔

تاریخ کا دوسرا اہم موڑ 1917 میں روس کا انقلاب تھا، جس نے زار روس کی حکومت کا تختہ الٹ کر وہاں کمیونسٹ حکومت کو قائم کیا۔ روسی انقلابیوں کا نقطۂ نظر یہ تھا

کہ اس نظریہ کو پوری دنیا میں پھیلایا جائے۔ اس لئے انہوں نے ایشیا و افریقہ اور یورپ کی کمیونسٹ پارٹیوں کی سرپرستی کی، اور دنیا میں اپنے ہمدرد پیدا کئے۔

اس کے بعد سے ریاست نظریاتی ہی ہونے لگی۔ اسلامی ملکوں میں، اسلامی جماعتوں نے اس بات کی کوشش کی کہ انقلاب یا جمہوری طریقوں سے ریاست پر قبضہ کر کے اسے اسلامی بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے ایران کی مثال ہے کہ جو ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہو گئی۔ افغانستان میں طالبان نے بھی اس ماڈل کو اختیار کرتے ہوئے ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کی تھی۔ آج بھی کئی اسلامی ملکوں میں، اسلامی جماعتیں اس جدوجہد میں مصروف ہیں کہ مغربی جمہوریت کے بجائے، ایک اسلامی نظریاتی ملک بنایا جائے۔

مذہب کے نام پر بننے والی نظریاتی مملکت اسرائیل کی ہے۔ جو مذہب کے نام پر بنائی گئی ہے اور جس میں یہودیت کی تعلیمات کے نفاذ کی بات کی جاتی ہے۔

لیکن مذہب کی بنیاد پر جو ملک نظریاتی بنتے ہیں، ان کا نظریہ عالمی یا یونیورسل نہیں ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے عقیدے کے لوگوں کو اس میں شامل کرتے ہیں، اور دوسرے مذہب یا عقیدے کے ماننے والوں کو اس سے خارج کر دیتے ہیں۔

اسی طرح جو ریاستیں نسلی اعتبار سے نظریاتی ہوتی ہیں، ان میں اپنی نسل کی برتری کا احساس ہوتا ہے، اور دوسری نسلیں کمتر اور انسانیت سے گری ہوئی ہوتی ہیں، جیسے نازی عہد میں آریہ نسل کے لوگوں کو برتر تسلیم کیا گیا اور جرمنی کی دوسری نسلوں کو کم تر، جن میں خاص طور سے یہودی اور خانہ بدوش قبائل شامل تھے۔ یہ نسل کی پاکیزگی پر

یقین رکھتے ہیں، اور اس بنیاد پر دنیا کو فتح کر کے دوسری نسلوں کو اپنا غلام یا ماتحت بنانا چاہتے ہیں۔

نظریاتی ملک کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں میں اپنے نظریہ کی بنیاد پر حمایتی پیدا کرتا ہے، اور انہیں اپنے مفاد اور مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ جیسے روس دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا تھا۔ یورپ میں اس نظریہ کے ایسے حامی بھی تھے کہ جنہوں نے اپنے ملکوں کے ان دستاویزات اور رازوں سے روس کو آگاہ کیا جو اس کی مخالفت میں تھے۔ ان میں سے بعض افراد کو غداری کے الزام میں سزائے موت بھی دی گئی، مگر ان کا اس نظریہ پر اس قدر اعتقاد تھا کہ انہوں نے اسے بخوشی تسلیم کر لیا۔

اس کے برعکس نظریاتی ملک اپنے نظریہ کے تحفظ میں کافی حساس ہوتا ہے، اور وہ نہیں برداشت کرتا کہ اس کی حدود میں دوسرے نظریات پیدا ہوں، یا اس کے نظریہ کی مخالفت کی جائے، یا اس پر تنقید کی جائے، اگر کچھ افراد اس میں ملوث پائے جاتے ہیں تو وہ نظریاتی دشمن اور غدار ہو جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں پر پابندی ہوتی ہے، انہیں قید و بند کی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس صورت حال میں نظریاتی ملک کے ادیب و شاعر، مورّخ و سماجی علوم کے قلم کار، ماہرین، آرٹسٹ، اور مجسمہ ساز اس نظریہ کے پروپیگنڈے کے لئے کام کرتے ہیں، اس کی سچائی کو ثابت کرتے ہیں، اس کے لئے نئی تاویلیں نکالتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نظریاتی سماج سے تحقیقی صلاحیتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ

تحقیق کے لئے آزادی اور اختلاف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس پر پابندی لگادی جائے تو نئے خیالات و افکار کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے، اور پورے معاشرہ کا دانشورانہ طور پر دیوالیہ ہو جاتا ہے، یہاں پر وہی تحقیق باقی رہتی ہے جو ریاست کے مفاد میں ہو۔

اس وجہ سے نظریاتی ملک ایک طرح سے اپنی حدود میں محصور ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے لوگوں کو باخبر رکھا جائے۔ نئے خیالات و افکار کو نظریہ کا دشمن قرار دیا جائے، اور انہیں اپنی حدود میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ صورت حال آہستہ آہستہ پورے سماج کو پس ماندہ بنا دیتی ہے۔

پاکستان کو ایک نظریاتی مملکت اگرچہ ابتداء ہی سے کہا جانے لگا تھا مگر اس کی پوری طرح سے وضاحت نہیں ہوئی تھی کہ اس کے نظریہ کی اساس کیا ہے۔ پاکستان کے کچھ دانشوروں کا یہ خیال تھا کہ ہر ملک کی بنیاد کسی نہ کسی نظریہ پر ہوتی ہے، اس لئے پاکستان کے لئے بھی کسی ایک نظریہ کی ضرورت ہے۔ 1949 میں قرارداد مقاصد نے مستقبل کی راہیں متعین کر دیں۔ اس کے بعد سے نظریہ کی بنیاد مذہب پر ہوگئی جس کو دستور میں اسلامی قرار دے کر پاکستان کو اسلامی مملکت بنا دیا۔

اس نظریہ نے آگے چل کر مزید تقویت حاصل کی جب 1973 کے دستور میں اسلام کو ریاست کا مذہب بنا دیا گیا اور احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔

اگرچہ پاکستان کو ایک نظریاتی ملک کہا جاتا ہے۔ مگر یہ دوسرے نظریاتی ملکوں

سے مختلف ہے یہاں دوسرے نظریات رکھنے والوں کی بھی گنجائش ہے جو اگرچہ تنگ ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ فوج اور نوکر شاہی جو ابتداء میں لبرل ذہن رکھتے تھے وہ بھی مذہبی انتہا پسندوں کی گرفت میں آ گئے ہیں لیکن یہاں کا سیاسی نظام چونکہ نظریاتی بنیادوں پر مستحکم نہیں ہے اور یہاں کبھی فوجی آمریت آ جاتی ہے تو کبھی جاگیردارانہ جمہوریت، اس سیاسی انتشار کی وجہ سے دوسرے نظریات کو اپنی بات سمجھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس طرح یہ ایران کی نظریاتی مملکت سے جدا ہے کہ جہاں دوسرے نظریات کے لئے کوئی علیحدہ جگہ نہیں ہے۔ اگرچہ دوسرے نظریات نے اس سیاسی انتشار سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ مگر اب بھی ان کے لئے اپنی تبلیغ کے راستے اور مواقع موجود ہیں۔

پاکستان کو ایک نظریاتی ملک بنانے کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ آزادی کے بعد یہ ایک قومی ریاست نہیں بن سکا۔ کیونکہ قومی ریاست میں ہر مذہب، فرقہ، نسل اور ذات کے لوگوں کو قوم کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا ہے۔

لیکن جب قوم کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی تو اس نے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو قوم کے دائروں سے نکال دیا۔ اس لئے دستور میں کہا گیا کہ ملک کا صدر مسلمان ہوگا، اور اس کے قوانین مذہب سے متصادم نہیں ہوں گے۔

اس نے قوم کو بحیثیت مجموعی کمزور کر دیا۔ جب غیر مسلموں کو یہ احساس ہوا کہ ان کے حقوق برابر کے نہیں، اور ان کے ساتھ متعصبانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے تو اس کے نتیجہ میں ان میں احساس محرومی پیدا ہوا۔

جب ایک مرتبہ قوم کی بنیاد مذہب پر رکھ دی گئی تو اس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ احساسات پیدا ہوئے کہ کون سے فرقے کی بالادستی ہوگی، لہٰذا مذہب بجائے اس کے کہ ہم مذہبوں کو متحد کرتا، اس نے مزید ان کو تقسیم کر دیا۔ اس نے مذہبی فسادات کی شکل اختیار کر لی اور ایک دوسرے کو گمراہ تصور کرتے ہوئے ان کو راستے سے ہٹانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

تاثرات

پاکستان جس صورت حال سے دوچار ہے، اس میں نہ تو ملک میں سیاسی استحکام ہے، نہ معاشی خوش حالی، نہ قانون کی بالادستی، اور نہ لوگوں کے جان و مال کا تحفظ حکمراں طبقے ریاست کے اداروں کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کر رہے ہیں، اور قومی مفادات کے نام پر لوگوں کے بنیادی حقوق پامال کر رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نظریہ کے نام پر ہر اس تحریک کو دبا دیا جاتا ہے کہ جو قدامت پرستی، اور انتہا پسندی کے خلاف ہیں۔

کیا پاکستان اس بحران سے نکل سکتا ہے؟ ایسا اس وقت ممکن ہے کہ جب فکری طور پر انقلابی اقدامات اٹھائے جائیں۔ سب سے پہلے تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ان قدیم بنیادوں کو مسمار کیا جائے کہ جن پر اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کے بعد آج کے دور کی مناسبت سے ریاست کو مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار قرار دیا جائے اور جمہوری اداروں کو مضبوط کرنے کے لئے جاگیرداری اور سرداری نظام کا

خاتمہ کیا جائے۔

لیکن تاریخ خواہشات کی بنیاد پر تشکیل نہیں ہوتی ہے۔اس کے پس منظر میں سیاسی، سماجی، اور معاشی قوتیں ہوتے ہیں۔ اگر یہ قوتیں پیدا ہوں، مضبوط ہوں اور آزاد ہوں تو اس صورت میں تبدیلی آ سکتی ہے۔ ورنہ قومیں ہزاروں سال سے پس ماندگی اور غربت کی حالت میں زندگی گذار دیتی ہیں۔

پاکستان اور تبدیلی کے محرکات

پاکستان کی سیاست ایک پنڈولم کی طرح متحرک ہے، یہ کبھی فوجی آمریت کی طرف چلی جاتی ہے اور کبھی جاگیردارانہ جمہوریت کی طرف۔ یہ ایک ایسا چکر ہے کہ جس میں عوام کے لئے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے، یا تو وہ آمروں کے جبر، تشدد، اور ان کے ظلم کو سہیں یا جاگیردارانہ جمہوریت میں موروثی خاندانوں کی سیاست پر اجارہ داری، ان کی سازشوں اور کرپشن کو برداشت کریں۔

ان باسٹھ سالوں میں چاہے وہ فوجی آمر ہوں، یا جاگیردار ذہن رکھنے والے سیاستدان جنہوں نے پاکستان کو ایک نظریہ کے حصار میں گرفتار کر کے، اس کے عوام کو ذہنی طور پر غلام بنا رکھا ہے۔ یہ نظریہ کہ جو دونوں حکمراں طبقوں کے مفادات کو تحفظ دیتا ہے، اسے ایک تقدس کی شکل دیدی گئی ہے کہ جس کے خلاف تنقید کرنا، یا جسے چیلنج کرنا ملک کی دشمنی کے مترادف ہے۔ اس نظریہ کو تقدس کا درجہ دینے میں ہمارا تعلیمی نظام اور ملک کا میڈیا پوری سرگرمی سے مصروف ہے۔ ان سب نے مل کر لوگوں کو ذہنی طور پر اس قدر مفلوج کر دیا ہے کہ وہ اپنی غربت، مفلسی، بیماری، بے روزگاری اور عدم تحفظ

کے باوجود اس کی سچائی کو تسلیم کئے ہوئے ہیں۔

لیکن تاریخ میں ہمیشہ سے قدیم و جدید روایات کے درمیان تصادم اور کش مکش جاری رہتی ہے۔ قدیم روایات اپنا جواز ہمیشہ ماضی میں تلاش کرتی ہیں کہ جس کی بنیاد پر ان کا استدلال ہوتا ہے کہ چونکہ روایات کے پیچھے آباؤ اجداد کے تجربات شامل ہیں، اور یہ روایات ماضی میں کامیاب رہی ہیں، اس لئے آج کے حالات میں بھی یہ ہمارے مسائل کا حل تلاش کریں گی، اور ہماری رہنمائی کریں گی۔ جب کہ جدید رجحانات کے لوگوں کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ یہ روایات ایک خاص ماحول اور وقت میں پیدا ہوتی تھیں، وقت کے گذر جانے کے بعد ان کی افادیت ختم ہوگئی، اب ہمیں وقت اور زمانہ کی ضرورت اور تقاضے کے تحت نئی روایات پیدا کرنا چاہئیں، جو ہمارے موجودہ حالات کو سمجھنے میں مدد دیں۔

اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ تجزیہ کریں کہ پاکستان میں وہ کون سی قدیم روایات ہیں جو اپنا وجود قائم رکھنے کی جدوجہد کر رہی ہیں، اور وہ کون سے جدید افکار ہیں کہ جو ان کو چیلنج کر رہے ہیں۔ مثلاً قدیم روایات میں، جاگیرداری و جاگیردارانہ کلچر، مذہبی انتہا پسندی، ہیرو ورشپ، عورتوں کا کم تر سماجی رتبہ، جس کے نتیجہ میں کاروکاری اور عزت کے نام پر قتل، فوجی آمریت اور یہ تصور کہ صرف ڈنڈے اور طاقت و جبر کے ذریعہ عوام کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔

سماج میں طبقاتی نظام یا اونچ نیچ کا فرق ضروری ہے، کیونکہ یہ فطرتی ہے، قدرت نے سب انسانوں کو برابر کا پیدا نہیں کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جدید قوتوں

میں مساویانہ حقوق، عورتوں کا سماجی رتبہ، اقلیتوں کے حقوق، آزادی رائے، مذہبی رواداری، ریاست کے مذہبی معاملات میں غیر جانبداری، عوامی جمہوریت، اور اس کے اداروں کی ضرورت، نوکر شاہی کی مراعات کا خاتمہ، معاشی خوش حالی، روزگار، صحت، تعلیم اور رہائش کے حقوق، ادب، آرٹ اور فنون لطیفہ کی ترقی۔

آرٹ

جب قدیم اور جدید روایات اور اداروں میں تصادم ہوتا ہے، اور قدیم رجحانات کمزور ہوتے ہیں، تو اس مرحلہ پر قدامت پرست دانشوروں کی جانب سے کوشش کی جاتی ہے کہ قدیم اور فرسودہ روایات کو نئے انداز میں پیش کیا جائے اور ان کی زندگی کی مدت کو مزید بڑھایا جائے۔

لہٰذا اس مرحلہ پر ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہمیں کس کا ساتھ دینا ہے، کیا قدامت پرستوں کے ساتھ مل کر ان کو استحکام دینا ہے یا جدید قوتوں کا ساتھ دے کر سماج کو بدلنا ہے۔

اس وقت جب ہم اس تصادم کا تجزیہ کرتے ہیں، تو ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ ریاست اور حکمراں طبقے مذہب اور سیاست کا سہارا لے کر ان قدیم روایات کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ وہ قدامت پرست دانشور ہی ہیں کہ جو ریاست کی مراعات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں جدید قوتوں کا ساتھ دینے والے اپنی کمزور اور مدھم آواز میں

احتجاج کر رہے ہیں، مگر صدیوں کی ذہنوں پر جمی ہوئی کائی، اتنی جلدی صاف نہیں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کی پذیرائی نہیں ہے، یہ سماج کے حاشیہ پر ہیں۔

اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں لوگ ان کی بات سننے سے گھبراتے ہیں، اور کیوں قدامت کی پس ماندگی کو قبول کئے ہوئے ہیں۔

اگر اس صورت حال کا تجزیہ کیا جائے کہ پاکستان کے سماج میں تبدیلی کا عمل اس قدر سست کیوں ہے؟ کیوں قدامت پرستانہ خیالات ذہنوں پر چھائے ہوئے ہیں؟ اور کیوں جدید نظریات لوگوں کے لئے اجنبی ہیں؟ تو اس کی وجہ ہمیں اس صورت حال میں نظر آئے گی کہ جہاں تبدیلی کے ایجنٹ اپنی سرگرمیوں میں آہستہ آہستہ کمزور ہوتے چلے گئے۔

تبدیلی کے ایجنٹوں میں سب سے اہم عنصر طلباء کا ہوتا ہے، یہ نوجوان جوش و جذبہ سے معمور ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ماضی نہیں بلکہ مستقبل ہوتا ہے جس کو خوشگوار بنانے کا عزم اور خواہش ہوتی ہے، اس لئے یہ جدید قوتوں اور ان کے نظریات سے متاثر ہوتے ہیں، جو ان کے سامنے ایک نئی دنیا کا تصور پیش کرتے ہیں۔ 1960 کی دہائی تک طالب علموں کی تحریک جاندار رہی، انہوں نے نہ صرف آمرانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی، بلکہ بیرونی اور اندرونی مسائل پر بھی لوگوں کو آگہی دی۔ ایوب خاں کے عہد میں طالب علموں کے خلاف اقدامات اٹھائے گئے، طلباء یونین پر پابندی لگادی گئی، ان کی سرگرمیوں کو ختم کردیا گیا، جس کے نتیجہ میں طلباء کی توانائی، اور طاقت آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئی، اور یہ سیاسی جماعتوں کے زیر اثر آکر ان کی

قدامت پرستانہ سیاست کا حصہ بن گئے۔

تبدیلی کا دوسرا اہم عنصر مزدوروں کا ہوتا ہے۔ پاکستان کے ابتدائی دور میں ٹریڈ یونینز بڑی فعال اور مضبوط تھیں، اس وجہ سے ان کی قوت کو توڑا گیا، یا مزید یونینز بنوائی گئیں، اوران کی تحریکوں کو ریاستی جبراور ظلم کے ذریعہ اس قدر کچل دیا گیا کہ ان میں دوبارہ سے ابھرنے کی ہمت نہیں رہی۔

کسانوں کی تحریک، جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے ہمیشہ سے کمزور تھی، وہ پوری طرح سے نہیں ابھر سکی۔ عورتوں کی مزاحمت کو بھی ریاستی اداروں سے دبا دیا۔ جب اقلیتوں نے حقوق کی بات کی تو ان کے خلاف لوگوں میں اس قدر نفرت بھری گئی کہ عیسائیوں اور ہندوؤں کے خلاف ہنگاموں نے انہیں سہا کر خوف زدہ کر دیا۔

رہے دانشور، تو ان کے لئے ریاست نے ادارے بنائے، انعامات وخطابات کا سلسلہ شروع کیا کہ جس نے اکثریت کو قدامت پرستوں کا ہمنوا بنا دیا۔

متوسط طبقہ سماج کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کرتا ہے، مگر سماج کو تبدیل کرنے کے لئے محنت، قربانی، اور آگہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے پیشہ ور جن میں ڈاکٹر، انجینئر، چارٹرا کاؤنٹنٹ اور اساتذہ شامل تھے، ملک سے ہجرت کر کے ان ملکوں میں چلے گئے کہ جہاں وہ خوشگوار زندگی گذار سکتے تھے۔ انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ بجائے اس کے کہ اپنے سماج کو تبدیل کر کے، اسے بہتر بنائیں، وہ ان معاشروں کا حصہ بن جائیں کہ جو پہلے سے بنے بنائے ہیں۔ جب سوچنے کا یہ انداز ہو، تو پھر سماج کو تبدیل کون کرے گا؟

پاکستان کے ساتھ یہی المیہ ہوا ہے، جو اس ملک میں رہ گئے ہیں وہ اپنی معاشی زندگی کو بہتر بنانے کی تگ ودو میں ہیں۔ سماج کی تبدیلی ان کے پروگرام کا حصہ نہیں ہے۔

کسی بھی سماج میں تبدیلی یا قدامت پرست روایات واداروں کے استحکام کے لئے سیاسی جماعتیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ سیاسی جماعتیں واضح طور پر یا تو قدامت پرست ہوتی ہیں کہ جس کا اظہار وہ اپنے منشور میں کرتے ہیں اور اقتدار میں آنے کے بعد اس پر عمل بھی کرتے ہیں، یا وہ سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں کہ جو ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دیتی ہیں، اور اپنے منشور میں اس کی وضاحت کرتی ہیں، اقتدار میں آنے کے بعد یہ روایتی اداروں کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان ہی میں وہ سیاسی جماعتیں بھی ہوتی ہیں کہ جو قدامت پرستی اور ترقی پسندی کے درمیانی راستہ کو اختیار کرتی ہیں۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے پاکستان کی سیاسی جماعتوں کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہاں قدامت پرست جماعتوں کا سیاست پر تسلط ہے۔ ان میں چاہے مذہبی سیاسی جماعتیں ہوں، یا نام نہاد لبرل سوچ رکھنے والی، جب بھی یہ جماعتیں برسر اقتدار آئیں انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے تمام فرسودہ قوانین اور روایات کو اُسی طرح سے برقرار رکھا، جس کی وجہ سے معاشرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ان سب نے نظریہ پاکستان پاک فوج کی برتری اور مذہبی انتہا پسندی کو سراہا۔

پاکستان کی ان سیاسی جماعتوں میں اندرونی طور پر جمہوری روایات کا فقدان ہے۔ ایک طرح سے یہ جماعتیں خاندانوں کی جاگیریں بن گئی ہیں کہ جہاں اب لیڈرشپ موروثی طور پر ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی ہے۔ ان کے سربراہ اپنے کارکنوں کو مزارع سمجھتے ہیں۔ ان کی خوشامد اور خوشنودی کے بغیر کسی رکن کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

لہٰذا سیاسی جماعتوں کے اس کردار کی وجہ سے معاشرے میں تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے ہیں، قدیم و جدید روایات کی کش مکش میں جدیدیت شکست خوردہ ہو رہی ہے۔

اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں کسی نئی بائیں بازو کی پارٹی کی ضرورت ہے؟ اس وقت بائیں بازو کی بہت سی پارٹیاں موجود ہیں، جو ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دے رہی ہیں، مگر کیا وجہ ہے کہ یہ پارٹیاں عوام میں وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکیں، جو کہ ان حالات میں انہیں کرنی چاہئے تھی کیونکہ سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر ہمارا معاشرہ انتشار، کنفیوژن، اور ابتری کا شکار ہے۔ لوگ حکمراں طبقوں کی بدعنوانیوں اور نااہلیت سے تنگ آ چکے ہیں۔ وہ ریاست کے جبر تلے اپنی توانائی اور طاقت کھو چکے ہیں، وہ خواہش مند ہیں کہ تبدیلی آئے۔ اب تبدیلی کے دو راستے ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

اول: اگر ریاست کو مکمل طور پر مذہبی بنا دیا جائے، اور شریعت کا نفاذ ہو جائے تو ان کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس نظریہ کے پس منظر میں ان کے سامنے

ماضی کی شان وشوکت کو بیان کیا جاتا ہے، اور ایک مثالی معاشرے کی تصویر کشی کی جاتی ہے کہ جوان کے ذہنوں میں جڑ پکڑ گئی ہے اس لئے وہ اس نظریہ پر یقین رکھتے ہیں، اوران قدامت پرست جماعتوں کا ساتھ دیتے ہیں کہ جو انہیں اس خواب کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کرتی ہیں۔

دوم: بائیں بازو کی پارٹیوں کا ریڈیکل نقطہء نظر ہے کہ جس میں وہ یہ استدلال دیتی ہیں کہ اگر جاگیرداری اور قبائلی نظام کو ختم کیا جائے، ریاست کو مذہبی طور پر غیر جانبدار بنایا جائے، اور ریاست ہر شہری کی تعلیم، صحت، روزگار اور رہائش کی ذمہ داری لےتو ملک میں خوش حالی آسکے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اس منشور کے باوجود، جو کہ عوام دوست ہے، ترقی پسند ہے، اور لوگوں کے مسائل کو حل کرنے کی بات کرتا ہے، لوگوں کی اکثریت ان جماعتوں کی حمایت کے بجائے، ان جاگیرداروں اور بدعنوان سیاستدانوں کا ساتھ دیتے ہیں کہ جوان کا استحصال کررہے ہیں اور کرتے رہیں گے؟

اس رویے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ایک اہم وجہ تو یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں اب تک اشرافیہ، یا جاگیرداروں، پیروں اور سجادہ نشینوں کی برتری وافضیلت بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ ''خاندان'' اس کی شرافت اور موروثیت پر یقین رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہ خاندانی اور اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے پاس دولت، جائیداد اور اثر ورسوخ ہے، اس لئے وہی ان کی صحیح راہنمائی کر سکتے ہیں۔ یہ قدامت پسندانہ سوچ، انہیں قدیم روایات کے تحفظ کی طرف لے جاتی ہے اور یہ راہنما ان کے

سرپرست اور مربی بن کر ابھرتے ہیں۔

دوسری جانب بائیں بازو کی جماعتوں کے خلاف پروپیگنڈا کولونیل دور سے شروع ہوا تھا اور پاکستان بننے کے بعد بھی جاری ہے، اس میں ان کی جو تصویر کشی کی گئی وہ یہ کہ یہ لوگ لادین ہوتے ہیں، اخلاقی اقدار کی پامالی کرتے ہیں، ان کے ہاں حرام وحلال کی کوئی تمیز نہیں ہے، یہ خاندانی روایات کو پامال کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس کردار کشی کی وجہ سے لوگوں کے ذہن میں جو تصویر ابھری وہ یہ کہ ان لوگوں سے دور رہا جائے۔

اس منفی پروپیگنڈے نے اس وقت اور زیادہ مقبولیت حاصل کر لی، جب پاکستان میں ان پر پابندی عائد کی گئی، ان کی جماعتوں کو غیر قانونی قرار دیدیا گیا، ان کے کارکنوں کو قید وبند کی اذیت سے گذرنا پڑا، ان کی تحریروں کو سنسر کر دیا گیا، اور زندگی کا دائرہ اس قدر تنگ کیا گیا کہ ان کے لئے معاشرے میں رہنا، اور اپنی بات کہنا مشکل ہو گیا، لہٰذا ان پابندیوں کی وجہ سے یہ لوگوں تک نہ جا سکے، اور محدود دائرے میں بند ہو کر رہ گئے۔

بائیں بازو کی جماعتوں کو اس وجہ سے بھی پابندیوں کا شکار ہونا پڑا، کیونکہ سرد جنگ کے دوران پاکستان مغربی بلاک میں تھا، اس وجہ سے بائیں بازو کی پارٹیاں اور افراد روس کے ایجنٹ اور ملک دشمن بن گئے تھے، جن کی نقل وحرکت پر ایجنسیاں ہر وقت نظر رکھتی تھیں۔

بائیں بازو کی جماعتوں کو اس وقت سخت دھچکہ لگا کہ جب روس کا زوال ہوا۔ یہ

شدید صدمہ تھا، کیونکہ وہ نظریہ کہ جس کی سچائی پر انہیں یقین تھا، اور جس کی خاطر انہوں نے پابندیاں اور اذیتیں برداشت کیں تھیں، وہ جب ٹوٹا تو اس نے انہیں افسردہ کر دیا، اور وقتی طور پر یہ جماعتیں مایوسی کا شکار ہوکر، نڈھال ہوگئیں۔

لیکن جہاں بائیں بازو کی پارٹیاں روس کے زوال کے بعد تنہائی کا شکار ہوئیں، وہیں انہوں نے بہت کچھ سیکھا بھی۔ اب یہ جماعتیں ہدایات کے لئے باہر کی جانب دیکھنے کے بجائے، اندرونی طور پر اپنے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

اس لئے موجودہ حالات میں کہ جب بائیں بازو کی پارٹیاں ابھر کر آ گئیں ہیں، اور انہیں عوام میں کام کرنے کے پورے پورے مواقع ہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ مارکس ازم کو آئیڈیالوجی کے بجائے بطور ایسے حربے یا (Tool) کے استعمال کریں کہ جس کی مدد سے وہ پاکستان کے سماج اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھ سکیں، اور اس تجزیہ کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل طے کریں۔

میرے نقطہء نظر سے ایک نئی بائیں بازو کی پارٹی کی ضرورت تو ہے، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ڈھانچہ اور اس کی تشکیل حالات کے مطابق ہو، اور ان ذرائع اور طریقوں کو اختیار کیا جائے کہ جو ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دیتے ہوئے، تبدیلی کے عمل کو تیز کریں۔

1- پارٹی کو محض سیاسی نعروں، اور جذباتی تقریروں کے بجائے، ٹھوس نظریاتی اور فکری مواد مہیا کرنا چاہیئے۔

2- اس فکری مواد کے لئے دانشوروں کا سیل قائم کرنا چاہیئے کہ جو موجودہ حالات کا

تجزیہ کریں، اور اس تجزیہ کو عوام تک پہنچایا جائے۔

3- نئی فکر اور نظریہ کے لئے ضروری ہے کہ موسیقی، آرٹ، تھیٹر اور فلم کا سہارا لیا جائے۔

4- بائیں بازو کی پارٹیوں میں اتحاد کی بات ہو رہی ہے، مگر میرے نزدیک یہ اتحاد لازمی نہیں ہے کیونکہ اگر پارٹی اپنے دائرے کار میں رہتے ہوئے ترقی پسند قوتوں کو آگے بڑھا رہی ہے تو اس کی راہ میں رکاوٹ کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں اتحاد کے بجائے بائیں بازو کی پارٹیوں کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے زیر اثر لائیں۔ پارٹی کی اہمیت اس وقت ہوگی کہ جب لوگوں کی اکثریت اس کے ساتھ ہوگی۔

آخر میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ قدیم اور جدید روایات اور اداروں کی اس کش مکش اور تصادم میں، پلڑا قدامت پرستی کا بھاری ہے۔ کیونکہ لوگ صدیوں کی روایات میں جکڑے ہوئے آسودگی پاتے ہیں۔ وہ مستحکم قدروں اور اداروں کو تبدیل کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ اس سے ان کی زندگی انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ انہیں میں اصلاح چاہتے ہیں، تاکہ معاشرہ اس طرح سے قائم رہے۔ وہ تخلیق کے بجائے تقلید کے قائل ہیں، کیونکہ اس میں سوچنے اور غور وفکر کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جب کہ تخلیقی عمل ذہنی طور پر اذیت سے گذرتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ ان مستحکم قدروں سے بغاوت کرتے ہیں، وہ معاشرے کے مجرم بن جاتے ہیں۔ لیکن جب معاشرہ تقلید کے راستے کو اختیار کر لیتا ہے، تو اس میں ایسے مفکر، فلسفی اور دانشور پیدا نہیں ہوتے کہ جو

فرسودہ عقائد کو چیلنج کرسکیں۔ لوگوں کے منجمد ذہنوں میں ہلچل پیدا کرسکیں، اور ٹھہرے ہوئے معاشرے کو آگے کی جانب لے جائیں۔

اس وقت پاکستان کا معاشرہ اسی صورت حال سے دوچار ہے، اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تبدیل ہوکر ترقی کی جانب بڑھے گا یا قدامت پرستی کی پس ماندگی میں رہے گا۔

پاکستانی میڈیا

پاکستانی میڈیا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آزاد ہے اور اپنی آزادی کی وجہ سے یہ معاشرے میں تبدیلی لا رہا ہے۔ اس مفروضہ کا شکار میڈیا کے لوگ بھی ہیں، جن میں صحافی اور اینکر پرسن شامل ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ میڈیا، معاشرے میں ہونے والی بدعنوانیوں اور جرائم کی نقاب کشی کر رہا ہے۔ روز اخبارات اور ٹی وی کے چینلو میں پولیس تھانوں میں، لوگوں کو جس طرح اذیت کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پولیس کے اہل کاروں نے ذرا سے شبہ کی بنا پر، یا کسی وجہ سے افراد کو پکڑ لیا، انہیں الٹا لٹکایا، زدوکوب کیا اور ان کے اس اذیت رسانی کی وجہ سے وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو اس کی لاش ورثاء کے حوالے کر دی کہ حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے مر گیا۔

یہ خبریں بھی روز آتی ہیں کہ امام بارگاہوں، مسجدوں اور درگاہوں میں بموں کے دھماکے ہوئے جن میں عورتیں، بچے اور مرد مارے گئے۔ ان فرقہ وارانہ فسادات، اور خودکش حملوں کی تفصیلات میڈیا میں آتی ہیں اور اس تواتر کے ساتھ آتی ہیں کہ اب

دیکھنے اور پڑھنے والوں کے لئے ان میں کچھ سنسنی خیزی نہیں رہی۔ ان خبروں اور ان کی تفصیلات نے ان لوگوں کو بے حس بنا دیا ہے۔ اب ان کے نزدیک یہ روزمرہ کا معمول ہے۔ اب اس کو معاشرہ کا ایک حصہ تسلیم کرلیا گیا ہے۔

کیا میڈیا کی ان خبروں اور معلومات کی وجہ سے تشدد، دہشت گردی، بدعنوانی، کرپشن ختم ہو گیا؟ ہم دیکھتے ہیں کہ میڈیا کے اس کردار کے باوجود تھانوں میں اسی طرح سے اذیت رسانی کا سلسلہ جاری ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات اسی طرح سے ہو رہے ہیں، بدعنوانی اور کرپشن بھی اسی طرح سے جاری وساری ہے۔

اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوچنا پڑے گا کہ صرف خبریں، معلومات، وعظ، پند و نصیحت کے ذریعہ معاشرہ نہ تو بدلتا ہے اور نہ ہی اس میں اصلاح آتی ہے۔ جب تک معاشرے کے بنیادی ڈھانچہ کو تبدیل نہیں کیا جائے گا، اور جب تک ریاست کے کردار کو نہیں بدلا جائے گا یہ سلسلہ اسی طرح سے جاری رہے گا۔

کیونکہ خبروں کی جڑ ریاست کے نظریہ میں ہے کہ جس میں ریاست کا تعلق ایک مذہب سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ دوسری مذہبی اقلیتیں مساوی درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ لہٰذا ان کے بنیادی حقوق کا معاملہ ریاست کے اس مذہبی جانبداری کی وجہ سے جائز ہو جاتا ہے۔

جب مذہب کو ریاست میں اولیت دی گئی تو اس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ جذبات کا پیدا ہونا بھی لازمی ہے۔ اس لئے کون گمراہ ہے اور کون حق پر اس کا

فیصلہ ہر فرقہ کرتا ہے۔

جب مذہب اور قوم پرستی کو ریاست جائز قرار دے تو دوسرے مذاہب کے ماننے والے اس سے خارج ہو جاتے ہیں۔

اس طرح معاشرے میں جب قانون کی بالادستی نہیں ہوگی، اور اہل اقتدار اور طبقہ امراء کے لوگ اس سے باہر ہوں گے تو کمزور اور زیردست لوگوں پر ظلم و اذیت سے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

جاگیرداروں، اور بیوروکریسی کے طاقتور ادارے اس قدر مضبوط اور بااختیار ہیں کہ یہ قانون کی زد سے باہر ہیں۔

اس لئے جب تک معاشرہ کا یہ مسئلہ رہے گا، اسی طرح سے قانون کی خلاف ورزی ہوگی، قتل و غارت گری ہوگی، اور لوگوں کو اس کا عادی بنا دیا جائے گا کہ جو اس نظام کو اسی طرح جاری رکھنے کے علاوہ اور کوئی دوسری کسی تبدیلی کی امید نہیں رکھیں گے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ پاکستان کے میڈیا کو معاشرے سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جائے۔ یہ بھی اس کا ایک حصہ ہے اور اس لحاظ سے یہ نہ صرف اس کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کی روایات اور اقدار کو مستحکم کرتا ہے۔

مثلاً میڈیا میں دو رجحانات ہمیں ملتے ہیں: ایک مذہب اور دوسرا قوم پرستی۔ اس کے پروگراموں، یہاں تک کہ اس کے اشتہاروں میں ہمیں یہ دونوں جذبات

نظر آتے ہیں۔

پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ ہر شخص اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ خود کو راسخ العقیدہ مسلمان اور محبّ وطن پاکستانی ثابت کرے ''ٹاک شوز'' میں اکثریت تو اس گفتگو سے آغاز کرتی ہے کہ میں خدا کے فضل سے پکا مسلمان ہوں، اور خدا کے علاوہ کسی اور سے نہیں ڈرتا ہوں۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ میں ایک محبّ وطن پاکستانی ہوں۔

اس کا مظاہرہ عام ٹی وی چینلز میں کیا جاتا ہے مگر جو مذہبی چینلز ہیں ان میں تو تبلیغ، وعظ اور تعویذوں کی بات ہوتی ہے۔

اس لئے کہا جاتا ہے کہ پس ماندہ کلچر میں اگر ٹیکنالوجی کا استعمال ہو تو یہ اسے اور زیادہ پس ماندہ بنا دیتی ہے۔ لہٰذا پاکستان میں اخبارات ہو یا چینلز یہ پس ماندہ روایات اور اقدار کو اور زیادہ مقبول بنا رہے ہیں۔

یہ بھی ایک مفروضہ ہے کہ پاکستانی میڈیا آزاد ہے۔ یہ اس لئے ممکن نہیں کہ جو اخبارات اور چینلز کے مالکین ہیں، ان کا اپنا ایجنڈا ہوتا ہے، جسے میڈیا کے ذریعہ پورا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایک حد تک یہ اپنی آزادی کا اظہار کرتے ہیں مگر اس کے بعد یہ پابندیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ میڈیا میں اب وہ لوگ سرمایہ کاری کرتے ہیں کہ جن کا کاروبار اور بزنس ہوتا ہے۔ میڈیا کے ذریعہ انہیں تحفظ مل جاتا ہے۔ اس لئے پاکستان کے میڈیا سے یہ توقع کرنا کہ یہ معاشرے کی اصلاح

کرے گا یا فرسودہ روایات و اقدار کے خلاف آواز اٹھائے گا، غلط فہمی ہے۔ یہ ان خیالات سے دور رہتے ہیں کہ جو معاشروں کی بنیادی روایات پر تنقید کرتے ہیں، یا جو پاکستان کے نظریہ کو چیلنج کرتے ہیں۔

میں اپنی مثال دوں گا کہ جیو نے میرے چار پروگرام یہاں ٹیلی کاسٹ نہیں کئے کیونکہ وہ ان کی پالیسی کے خلاف تھے۔ سنسر شپ صرف حکومتوں کی جانب سے ہی نہیں ہوتی ہے، بلکہ یہ چینلز اور اخبارات کی اپنی سنسر شپ ہے جو کانٹ چھانٹ کرتے ہیں، یا مضامین و پروگراموں کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ جب ڈاکٹر صفدر محمود نے میرے ایک مضمون پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تو ان کا یہ مضمون اردو کے تمام اخبارات میں بیک وقت شائع ہوا۔ جب میں نے اس کا جواب دیا تو صرف خبریں اخبار نے چھاپا اور باقی اخبارات نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ آج بھی یہ رویہ اخبارات اور چینلز کا ہے کہ یک طرفہ بات کی جاتی ہے، اگر کوئی اسے چیلنج کرے تو اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

لہٰذا اس صورت حال میں میڈیا گھسے پٹے، فرسودہ خیالات کو بار بار دہراتا رہتا ہے۔ لیکن بنیادی نظریات و خیالات کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اسی کو سچائی سمجھ کر اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس تنگ نظر ماحول میں اگر علیحدہ سے بات کہی جائے تو وہ نہ تو محبّ وطن پاکستانی ہوتا ہے

اور نہ پکا مسلمان۔

میڈیا کی یہ نام نہاد آزادی جو ذہن پیدا کر رہی ہے اس میں خیالات کی پس ماندگی اور ذہنی تنگ نظری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

پاکستانی میڈیا نے ایک جانب تو ایک ایسی زبان کو رواج دینا شروع کیا ہے کہ جو عام لوگوں کی فہم اور سمجھ سے بالاتر ہے۔ آدھی انگریزی اور آدھی اردو کا میلاپ ایسی زبان تشکیل کر رہا ہے جو ہمارے کلچر سے دور ہے۔ اس ملک میں عام لوگ مشکل اردو سمجھ نہیں پاتے، چہ جائیکہ کہ اسے اور آسان و سہل بنایا جائے ہم اس میں انگریزی کی ملاوٹ کر کے اسے عوام سے دور کر دیتے ہیں۔

دوسری جانب ٹاک شوز میں جو گالم گلوچ ہوتی ہے اور زور زور سے بول کر صحافت کی آواز کو دبانے کی کوشش ہوتی ہے، تو اس میں شائستگی، شرافت اور تہذیب کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ استدلال کے بجائے جذبات کا اظہار ہوتا ہے اس سے ہمارے معاشرے کی ذہنی پس ماندگی کی تصویر ابھر کر آتی ہے۔

لیکن پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ ایک اور میڈیا ہے کہ جو لوگوں کو آزادی رائے، اور اظہار کی آزادی کے مواقع فراہم کرتا ہے یہ انٹرنیٹ ہے۔ یہاں وہ مضامین تشہیر ہو سکتے ہیں کہ جن کے لئے اخبارات میں گنجائش نہیں ہے۔ یہاں بحث و مباحثہ میں آزادی کے ساتھ ان مقالات کا اظہار ہو سکتا ہے کہ جس کے لئے ٹاک شوز میں جگہ نہیں ہے۔ اس لئے یہاں مختلف نظریات کے لوگ ہیں کہ جو اپنے

خیالات وافکار کے ذریعہ اپنی بات کہہ رہے ہیں۔

لہٰذا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں انٹرنیٹ میڈیا انقلابی خیالات کے ذریعہ لوگوں کی سوچ اور فکر کو بدل سکے اور قدیم وفرسودہ روایات کو مٹا سکے۔

یہ ایک ایسا آزاد میڈیا ہے جو اخبارات اور ٹی وی کے چینلز کو بھی مجبور کرے گا کہ وہ اپنے اندر تبدیلی لائیں، یا وقت کے ساتھ اپنی افادیت کھو دیں۔